اکتوبر ۱۹۹۶ء

ماہنامہ مجلہ

حیات نو

بلریاگنج

توبہ

قبول ہونے یا نہ ہونے کے متعلق

نظام الدین اولیاءؒ نے ایک عجیب بات فرمائی کہ
اگر کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ فلاں گناہ کرنے
کے بعد جو توبہ کی تھی وہ قبول ہوئی تھی کہ
نہیں اس کا معیار یہ ہے کہ دیکھنا
چاہئے کہ گناہ کے یاد آنے سے نفس میں
حظ (لذت) پیدا ہوتی ہے یا نفرت
اور کدورت، اگر نفرت ہوتی ہے تو
توبہ قبول ہو چکی ہے اگر حظ ہوتا ہے تو توبہ
قبول نہیں ہوئی دوبارہ توبہ کرنا چاہئے۔

(اشرف علی تھانویؒ)

ادارہ علمیہ جامعۃ الفلاح کی مطبوعات

دینی مدارس اور انکے مسائل قیمت : ۳۰ روپیہ

اس موضوع کے مختلف گوشوں پر مولانا ابوالعرفان ندوی، مولانا حبیب الرحمن عمری، مولانا فاروق خاں، مولانا مقتدیٰ حسن ازہری، مولانا عزیر صاحب المظاہری، مولانا مجیب اللہ ندوی اور سید حامد سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ وغیرہم کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کے دوسالہ کونشن منعقدہ ۱۲/ ۱۳/ فروری ۱۹۸۹ء میں پیش فرمائے تھے۔

نقوش و تاثرات قیمت : ۸ روپیہ

مولانا جلیل احسن ندوی کے اہم مضامین کا دلکش اور خوبصورت مجموعہ

ساہتیہ پربھا مرتب : ڈاکٹر کوثر یزدانی قیمت : ۱۵ روپیہ

ثانوی درجات کیلئے اسلامی مزاج کے مطابق تیار کردہ ہندی نصابی کتاب

ہندی ساہتیہ سمن (درجہ پنجم، ششم و ہفتم کیلئے سپلیمنٹری بک)

قیمت : ۱۵ روپیہ

جس میں ہندی قوائد، ہندی شعراء کا تعارف اور دیگر مفید چیزیں جمع کردی گئی ہیں جو بچوں کو ہندی سکھانے کے لئے بڑی مفید ثابت ہوں گی۔

ملنے کا پتہ	
	ادارہ علمیہ جامعۃ الفلاح بلریاگنج، اعظم گڑھ ـ 276 121 (یو۔پی۔)
	مرکزی مکتبہ اسلامی، چتلی قبر، دہلی ـ 006 110

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ

حیات نو

بلریاگنج

جلد نمبر ۱۳	جمادی الآخر ۱۴۱۹ھ اکتوبر ۱۹۹۸ء	شمارہ نمبر ۱۰

مدیر مسئول	مدیر	مدیر معاون
نور محمد فلاحی	عبدالبر اثری فلاحی	انیس احمد فلاحی

☆ سالانہ زرتعاون : 50.00 روپے	☆ طلبہ کے لئے : 40.00 روپے
☆ خصوصی زرتعاون : 100.00 روپے	☆ اعزازی زرتعاون : 1000.00 روپے
☆ بیرون ملک سے : 25.00 امریکی ڈالر	☆ قیمت فی شمارہ : 5.00 روپے

اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے لہذا جلد سالانہ زرتعاون ارسال فرمائیں۔

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

ترسیل زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ "مجلہ حیاتِ نو" جامعۃ الفلاح

بلریاگنج۔ اعظم گڑھ ۲۷۶۱۲۱ (یو۔پی۔) فون نمبر 05466-25115

نقوش حیاتِ نو

اداریہ		
ففروا الی اللہ	عبدالبر اثری فلاحی	۳
بحث ونظر		
فکر ونظر کے چند پہلو	عبدالعزیز سلفی فلاحی	۶
ہدایت کے چراغ		
سعید بن جبیرؒ	ابو جلیس ندوی	۱۹
مذاہب عالم		
نصرانیت	انیس احمد مدنی فلاحی	۲۷
سیر و سوانح		
ذکر جلیلؒ	عبدالرب اثری فلاحی	۳۵
تعارف و تبصرہ		
بزم سرسید	ابو عبدالرحمن عمار فلاحی	۴۲
جامعہ کے لیل ونہار		
قیم جماعت محمد جعفر صاحب کی آمد		
انعامی سیمینار		
بین المدارس انعامی مقابلہ		
دعوتی وفود		۴۴
روداد انجمن		
رپورٹ دہلی یونٹ	محمد ارشد فلاحی	۴۹

اداریہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ففروا الی اللہ

عبدالبر اثری فلاحی

معرکۂ اسلام و جاہلیت کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی جاہلیت کے علمبرداروں نے یہ محسوس کیا ہے کہ حق کی خوبیاں لوگوں کو متاثر کر رہی ہیں اور ان کی خامیاں لوگوں پر واضح ہوتی جا رہی ہیں نتیجۃً افراد ان کے دام سے نکلتے جا رہے ہیں تو بجائے اس کے کہ حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے خود بھی ان خوبیوں کو اپنالیں، معاندانہ فطرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیشہ انھوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ کسی طرح اہل حق کے اندر بھی وہی کمزوریاں اور برائیاں پیدا کر دیں جو خود ان کے اندر ہے اور اگر کسی طرح یہ ممکن نہ ہو سکے تو کم از کم ان پر اس قدر کیچڑ اچھالا جائے کہ ان کی خوبیاں بے داغ نظر نہ آئیں۔

یہی کچھ صورت حال اس وقت ہر سطح پر دشمنان اسلام کی ہے۔ کیونکہ وہ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے اور ہماری بساط سمٹتی جا رہی ہے تو بجائے اس کے کہ ہوشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے وہ حق کو اختیار کر لیں اور باطل سے دست بردار ہو جائیں انھوں نے یہ مہم شروع کر دی ہے کہ اسلام کی تصویر ہی بگاڑ دیں اور اہل اسلام پر اس قدر کیچڑ اچھالیں کہ وہ داغدار معلوم ہونے لگیں۔ چنانچہ "بنیاد پرستی" کا الزام ہو یا "دہشت گردی" کا، سیرت رسول پر "حملے" ہوں یا اسلامی تاریخ کو "مسخ کرنا"، تعلیمات الٰہی کا "استہزاء" ہو یا علماء و قائدین ملت کی "کردار کشی" یہ سب اسی مہم کا حصہ ہیں۔

ایسے میں سب سے زیادہ توجہ طلب امر یہ ہے کہ ہم حق کی خاطر صبر و ثبات کا ثبوت دیں کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمنوں کی تصویر بگاڑنے کی کوششوں سے متاثر ہو کر ہم کسی غلطی یا انتشار ذہنی کا شکار ہو جائیں جیسا کہ سیکولر ذہنیت رکھنے والوں اور جدت پسندوں کی طرف سے مختلف مظاہر سامنے آتے رہتے ہیں۔

دوسری طرف ہمیں دعوت دین کے کام کو تیز تر کر دینا چاہیے کیونکہ تصویر بگاڑنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں ان کا تریاق یہی ہے۔ اس سے جہاں ان کے پیدا کردہ اثرات کو زائل کیا جا سکتا ہے وہیں اتمام حجت کے پہلو سے بھی ضروری ہے۔

تیسری طرف ہمیں اپنے داخلی محاذ کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے کہیں کوئی رخنہ یا شگاف نہ ہو کیونکہ ایسے ہی مقامات سے دشمن حملہ آور ہوتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اخلاقی میدان میں درجہ کمال پر پہنچنے کی کوشش کریں کیونکہ ہمارا اصل سرمایہ یہی ہے۔ ہماری کامیابی کا راز اسی میں پوشیدہ ہے۔ اخلاقی برتری ہی ہمیں دوسروں سے ممتاز اور موثر بناتی ہے۔ ورنہ جہاں تک تعداد کا سوال ہے دشمن ہم سے زیادہ ہیں۔ وسائل و ذرائع میں بھی ہم نسبتاً پیچھے ہی ہیں۔ اثر و رسوخ کے اعتبار سے تو کسی گنتی میں ہی نہیں آتے۔ بس ہے ہمارے پاس تو اخلاق و کردار ہی ہے اس میں ہم جس قدر فوقیت حاصل کریں گے اسی قدر موثر بنیں گے۔ اسی قدر ہمارے اندر یگانگت اور قربت پیدا ہوگی۔ اتحاد اور نظم و ضبط پیدا ہوگا اور پھر اسی کے بل پر دشمنوں کو زیر کر سکیں گے۔ جیسا کہ پوری اسلامی تاریخ شاہد ہے۔

اسی تناظر میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جماعت اسلامی ہند نے "ففرّوا الی اللّٰہ" (پس دوڑو اللہ کی طرف) کا جو نعرہ دیا ہے وہ بر وقت ہے اور اس میں ہر ایک کے لیے پیغام ہے۔

علمبرداران باطل کے لیے یہ پیغام کہ اسلام کے مسلسلے اثرات کو دیکھ کر حق کی حقانیت کا جو احساس ان کے دل میں پیدا ہو رہا ہے اس پر لبیک کہیں۔ جلد از جلد اپنے آپ کو اللہ کی بندگی میں دے دیں کہ موت کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔

عامۃ الناس کے لیے یہ پیغام کہ اسلام جس کے خلاف اس قدر زور آزمائی ہو رہی ہے اسے سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ شرک و بت پرستی جس کا وہ شکار ہیں اور اللہ واحد کی بندگی و پرستش جس کی طرف اسلام بلاتا ہے ان دونوں کا موازنہ کر کے دیکھیں کہ کون ان کے لیے مفید ہے؟ کہاں انہیں امن و سکون اور خوش حالی نصیب ہو سکتی ہے؟ کہاں ان کی دنیا و آخرت دونوں سنور سکتی ہے؟ ذرا غور کریں خود ان کا ضمیر پکار اٹھے گا کہ نجات تو صرف اسلام میں ہے۔ پھر انتظار کس چیز کا، دوڑیں اللہ کی طرف۔

خود امت مسلمہ اور داعیان اسلام کے لیے یہ پیغام ہے کہ دشمنوں کے ان جارحانہ حملوں کا مقابلہ چونکہ اللہ کی نصرت اور تائید کے بغیر ممکن نہیں اس لیے جہاں مقابلہ اور اس کی تیاریاں ضروری ہیں وہیں سب سے زیادہ ہم اس کے محتاج ہیں کہ اللہ کا قرب حاصل کریں اسی سے لو لگائیں، اسی سے رجوع کریں تاکہ اس کی نصرت و تائید حاصل ہو

کیونکہ [illegible] ۵ [illegible]

اسی قدر زیادہ اللہ کی طرف آپ کا رجوع بڑھ جاتا۔ ہم تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہیں زیادہ محتاج ہیں۔ ففروا الی اللہ — ففروا الی اللہ پس دوڑو اللہ کی طرف .... پس دوڑو اللہ کی طرف۔

بقیہ ص ۳۳

(۵) اعمال ۴/ ۲۶، ۲۷

(۶) اعمال ۱/ ۳۰

(۷) اعمال ۵/ ۳۵۔ ۴

(۸) یہ پوری تفصیلات ڈاکٹر سعادت نے انجیل برنباس کے عربی ترجمہ کے مقدمہ میں ذکر کی ہے۔

(۹) محاضرات فی النصرانیہ محمد ابوزہرہ ص ۵۸

(۱۰) ایضا ۵۸

(۱۱) یسعیاہ ۷/ ۱۴

(۱۲) زبور ۲/ ۷

(۱۳) دیکھیے آکسفورڈ بائبل کنکارڈنس ۲۳۱ بحوالہ حاشیہ تقی عثمانی علی اظہار الحق ۳/ ۸۶۲

(۱۴) ۲۵/۹

(۱۵) دیکھیے سنن ابی داؤد، کتاب المہدی ح ۴۲۶۵، مستدرک الحاکم ۴/ ۵۵۸، سنن ابن ماجہ ۲/ ۱۳۶۸، رسالہ عبدالعلیم فی المہدی ۹۰

(۱۶) محاضرات فی النصرانیہ ص ۵۹

(۱۷) ایضا ۵۸

(۱۸) انجیل برنباس ۲/ ۲۹، ۳/ ۲۵، ۷/ ۳۹

(۱۹) مثال کے طور پر مسیح علیہ السلام کا یہ ارشاد ملاحظہ ہو "تب تو قیصر کا حق قیصر کو دیدو اور اللہ کا حق اللہ کو۔ (۵/ ۲۱)

(۲۰) انجیل برنباس ۳

(۲۱) ایضا ۷۹، ۸۹، ۱۲۹، ۲۷۸

(۲۲) ایضا ۷۶، ۹۸، ۳۰۰

(۲۳) ایضا ۳۰۸، ۳۲۰

فکر و نظر کے چند پہلو

عبدالعزیز سلفی فلاحی

توحید اسلام کی قوت حیات ہے، وہی مسلمانوں کیلئے قوت ماسکہ (Binding Force) بھی ہے اور قوت محرکہ (Motive Force) بھی۔ وہ زندگی کو اک عظیم مقصدیت سے آشنا کرتا ہے اور پاکیزہ نصب العین کی حرارت سے زندگی کو پر بہار بناتا ہے۔

مشرق وسطی سے آنے والے نو مسلم حکمراں اسلام کا یہی ثقافتی ورثہ (Legacy) لے کر شرک کی سرزمین ہندوستان پر وارد ہوئے اور برق رفتاری سے برہمن دیوتا کی خدائی کی بساط لپیٹ دی۔ حالات کو نامساعد دیکھ کر وہ خانقاہ اور دیر و غار میں بیٹھ کر زیر زمین گھٹنے دکھانے اور عظیم جد وجہد (Master Action) میں مصروف ہو گیا۔

ابوریحان البیرونیؒ گیارہویں صدی عیسوی میں محمود غزنویؒ کے ہمراہ ہندوستان آئے انہوں نے یہاں کی زبان، علوم، ثقافت، سماجیات، سیاسیات اور نفسیات کا بڑا گہرا مطالعہ کیا۔ اپنی مشہور کتاب "الہند" کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ برہمن مسلمان کو ملیچھ کہتے ہیں۔ ملیچھ انسانیت سے گرا ہوا ایک ایسا شخص ہے جس کا وجود ہی نفرت انگیز ہے۔ البیرونی ایسا عالم ہے جس نے ہندو مذہب کی تمام کتابیں اس کے اصلی ماخذ سنسکرت میں پڑھیں اور انکے ترجمے کئے۔ ہندو کلچر اور برہمن نفسیات پر تحقیق کے بعد لکھا ہے کہ "ہم نے ان امور کا تفصیلی جائزہ اس وقت اسلئے پیش کیا ہے تاکہ قاری کو تقابلی مطالعہ سے معلوم ہو جائے کہ اسلام کے اور کتنے زیادہ ترقی یافتہ ہیں اور ان (ہندو) کے رسوم و قوانین کا تضاد اپنی تمام خرابیوں کی وجہ سے اتنا قبیح ہے کہ ان کا اسلام سے کوئی مقابلہ ہی نہیں ہو سکتا۔"

ہندو مذہب حکمراں قوم (برہمن) کا مذہب تھا جس نے تمام مذاہب کو اپنا تحت

اور محکوم بنا رکھا تھا۔ اسلام کی تعلیم توحید و مساوات نے دیگر اقوام کو بہت متاثر کیا۔ وہ مسلمان ہو کر ان سے بہتر سماجی و سیاسی رتبہ پانے لگے۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کو برہمنوں کا سیاسی کے ساتھ ساتھ مذہبی و سماجی دشمن بھی بنا دیا۔ اب وہ مسلمانوں کو اپنے ایسے دشمن کے طور پر محسوس کرنے لگے جو برہمن دیوتا کا ازلی دشمن اور ان کے مذہبی تقدس، سماجی عظمت اور سیاسی رتبہ کا سب سے بڑا حریف تھا۔ یہ دشمنی سیاسی و عارضی نہ تھی بلکہ اپنے اصول و مقاصد اور مطمح نظر کے اعتبار سے ابدی و دوامی تھی۔ برہمن ہندو دانشور اس سے سخت پریشان ہوئے، اسلام کی عادلانہ تعلیم کے اثرات کو زائل کرنے اور اس ملک کی اکثریت کو اس کی برکتوں سے محروم رکھنے کی کوشش کی۔ برہمو سماج، بھگتی تحریک، موہن رائے کی اصلاحی خدمات، پنت کبیر، آریہ سماج، سکھ پنتھ، کانگریس، ہندو مہا سبھا، جن سنگھ، آر ایس ایس، بی جے پی اشتراکی و سماج وادی تحریکات، وشو ہندو پریشد، بھوجن نظریات وغیرہ کی قدیم و جدید تنظیمیں باہمی اختلافات کے باوجود حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ یہ بھی شرک کے جوہڑ سے سیراب ہو رہی ہیں۔ یہ سبھی اسی دیوتا کی پیداوار ہیں اس لئے اپنی فطرت و نفسیات کے لحاظ سے اسلام دشمنی اور مسلم مخالفت کا شدید جذبہ رکھتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ بعض کی دشمنی سطح جذبات پر موجزن ہے اور بعض کا مصلحتوں کی تہ میں نہاں ہے مگر سوچ اور اقدام میں یکسانیت ہے۔ یہ تحریکیں اپنا مختلف سماجی منظر اور پس منظر رکھتی ہیں مگر سب کا شجرہ ایک ہی ہے۔ یہ تحریکیں کبھی سیاسی رہیں کبھی مذہبی لبادہ اوڑھ کر سامنے آئیں، کبھی اصلاح کا ورد سیکھتی ہوئی منظر نما ہوئیں کبھی دفاع کا مورچہ سنبھالا تو کبھی جارحیت کی فصل اگائی۔ سماجی حالات اور سیاسی مصلحتوں کے مطابق حکمت عملی بدلتی رہی۔ دیر و خانقاہ سے لے کر قلعہ و محلات تک جولانیاں دکھائی گئیں اور ہر اس فکر اور طاقت سے مدد لی گئی جو اسلام اور مسلمانوں کے مقابلہ میں موثر ہو سکے۔ اشتراکیت ایک غیر ملکی نظریہ ہے مگر سنگھ ہندو برہمن اس سے پرہیز کا تکلف بھی نہیں کرتے۔ برطانوی استعمار سے ان کی دوستی

اور حلیفانہ رابطہ ان کے سودیشی خیالات کے لئے قطعی سودمند رہا ہے۔

عالمی یہودیت، اسرائیل اور جرمن نسل پرستوں سے اس دیوتا کا نسلی و تہذیبی رشتہ ہے۔ انکی تمام سیاست کا محور، آزادی کے تصور، قومیت و سیکولرازم کے مفہوم کا ماخذ ہندتو ہے یعنی ہندو ثقافت، برہمنی تہذیب اور راشٹر یا دھرم کے تحت تمام مذاہب، تہذیبوں اور اقوام پر مکمل غلبہ۔ برہمنی ثقافت کے اجزائے ترکیبی کے عناصر حسب ذیل ہیں:

۱۔ اصنام پرستی، ۲۔ اصنام پرست کلچر کا فروغ (اصنام کے نام پر افراد، مقامات اور اشیاء کے نام رکھنا، مندروں کی بکثرت تعمیر)، ۳۔ سنسکرت زبان وادب اور حروف کی بالادستی، ۴۔ گائے کا تقدس، ۵۔ برہمنی روایات، تہواروں کو قومی و سرکاری حیثیت دینا۔

یہ ہندتو کے ارکان خمسہ ہیں۔ سن ۱۹۴۷ء سے ہی غیر مذہبی حکومت میں مذہبی سے زیادہ آئینی، قانونی اور ثقافتی حیثیت میں انہیں فروغ دیا گیا۔ سیاست، تعلیم، قانون اور حکومت کی قوت قاہرہ کے ذریعہ سماجی اور ثقافتی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی گئی کیونکہ گاندھیائی تصور آزادی اسی ثقافت پر مبنی تھا اور تحریک آزادی کا بطن نصاب یہی تھا مگر جارحیت پسند برہمنوں کیلئے یہ رفتار انقلاب اطمینان بخش نہیں ہے۔ دستوری و حکومتی تبدیلیوں کے ذریعہ وہ جلد از جلد اپنے آخری اہداف حاصل کرنا چاہتے ہیں، یعنی اپنی کبریائی کے اصل حریف مسلمانوں کا بحیثیت مسلمان خاتمہ اور دیگر اقوام میں حریفانہ کشمکش کو مٹا کر برہمن دیوتا کی خدائی کا قیام۔ جو ان ارکان خمسہ پر ایمان لائے اور اس میں وفاداری، خدمت اور اطاعت کے جوہر دکھائیں، وہ ہندتو کے کارسیوک کی حیثیت سے اس کو قبول کیا جاسکتا ہے اور اس خدمت کے صلہ میں عطاء بخشش کا سزاوار ہو سکتا ہے۔ اس کا نام خواہ کچھ بھی ہو اور وہ کسی بھی قوم میں پیدا ہوا ہو جیسے سکندر بخت، مختار نقوی، اسلم شیر خان اور مسٹر جلال وغیرہ۔ مگر جو اس کا انکار کرے اسکے لئے ہندتو کے رام راجیہ میں کوئی جگہ نہیں۔ واجپئی کے لفظوں میں ترسکار، دھتکار یعنی بے رخی، بے اتفاقی، تباہی و تاراجی اس کا مقدر ہے۔

عہد مغلیہ، اسلامی تہذیب اور برہمن کی ہندو تہذیب کے درمیان کشمکش اور اعصابی، لسانیاتی، ثقافتی و سماجی اور سیاسی جنگ کا دور ہے۔ یہ جنگ ہمہ جہت بھی ہے اور خوفناک بھی۔ اس جنگ کا ایک دور بابر سے شروع ہو کر عالمگیر پر ختم ہوتا ہے۔ عہد اکبری ہندو تہذیب کے عروج اور شباب کا دور ہے جب کہ عہد عالمگیر اسلامی تہذیب کی عظمت و بالادستی کا دور شباب ہے۔

دوسرا دور محمد شاہ رنگیلے سے شروع ہو کر سن ۱۹۴۷ء پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں انگریز ایک اہم عامل کی حیثیت سے شریک ہیں۔ انگریزوں کی شرکت سے یہ کشمکش مقامی حدود سے نکل کر عالمی حیثیت اختیار کر لیتی ہے اور اس کا نتیجہ تقسیم ملک اور قیام پاکستان کی صورت میں سامنے آیا۔

مسلمان اور برہمنیت کی تیسری جنگ صبح آزادی سے تاحال جاری ہے۔ مسلمان سیاسی، تعلیمی، اقتصادی اور سماجی اعتبار سے حیرت انگیز طور پر پچھلے پچاس برسوں سے اندھیروں کے لقموں میں کھنچے جارہے ہیں، ہر محاذ پر انکی پسماندگی، گریہ پائی، پامالی، پسپائی، افلاس، امتیاز، بے اتفاقی و بے رخی قومی سطح پر اس قدر دردناک ہے کہ اسکی تعبیر کیلئے تمام الفاظ و آہنگ عاجز ہیں۔ ہندتو کے ایک سپہ سالار اے بی واجپئی نے اپنے احساسات کا اظہار اکثریت والی تقریر میں اس طرح کیا ہے کہ مسلمانوں سے تین طرح کا معاملہ کیا جاسکتا ہے، ۱۔ بے رخی اپنائی جائے، ۲۔ خوشامد، چاپلوسی کی روش اختیار کی جائے، ۳۔ شدھی کے ذریعہ Indianise کر لیا جائے۔

اکبری برہمن نواز پالیسیوں نے مغل سلطنت اور مسلمانوں کے مستقبل کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ اس سے پہلے سلطنت کی پالیسی یہ تھی کہ مختلف شعبوں کے ماہرین: علماء و مشائخ، ہنرمند، پیشہ ور، دستکار، شاعر و ادیب، اہل علم، سورما، ماہرین جنگ اور طالع آزما مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ وسط ایشیا سے جاری تھا۔ ارکان سلطنت امراء، سپہ سالار، ریاستوں کے گورنر و والیان ریاست انہیں پر مشتمل تھے اور بڑی حد تک ان میں احساس قومیت، مہر و وفا، تہذیبی انفرادیت اور ملی غیرت کا شعور تھا لیکن اکبر نے اونچی ذات کے ہندوؤں، برہمن اور راجپوت، کو شریک سلطنت کر لیا، عمائدین کی صفوں میں پہنچ کر انہیں اس بات کا موقع ملا کہ

سہولت کے ساتھ اپنے منصوبوں کو روبہ عمل لائیں اور مسلم ہندوستان کے خلاف وسیع پیمانہ پر آہستہ روی کے ساتھ تعلیمی، سیاسی، تہذیبی، دینی و اخلاقی تبدیلی کے ساتھ اپنے منصوبوں کو روبہ عمل لائیں اور برہمنی انقلاب کے لئے اپنی زیر زمین کوششوں کا نتیجہ خیز آغاز کر سکیں۔ تاریخ میں پہلی بار محلوں میں مشرک ہندو رانیاں داخل ہو گئیں، مندر بنے، مینارے زمیں بوس ہوئے کلس نمودار ہوئے۔ قرآن پر پابندی لگی، گیتا کو تقدس ملا، گائے حرام ہوئی سور کو مقدس بتلایا گیا، ہندو شعار مقبول ہوا مسلم وضع ہدف تضحیک بنی۔ آخر تہذیب بنائے گئے پراچین کال کو آواز دی گئی، مشرکین سرفراز ہوئے اہل دین پامال کئے گئے۔ تجربہ کار مسلمان، ترک، ایرانی و افغانی درباری سازشوں کا شکار ہو کر بے اثر ہو گئے۔ برہمن، راجپوت اور بنئے سیاست، فوج اور مالیات پر چھا گئے۔ مشرک رانیوں اور روشن کنیاؤں نے اپنی مخصوص صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے مسلم امراء کو دیوار سے لگا دیا۔ عالم پناہ کو عالم اسلام سے چھین لیا۔ مشرق کی یہ عظیم الشان مسلم ریاست مسلم دنیا سے بے نیاز ہو گئی اور بڑی حد تک Indianise Localise ہو کر رہ گئی۔ پھر تو قانون ملکی، سیاست خارجہ اور تمام پالیسی امور میں ذہن ہندی نے خوب گل کھلائے۔ مقامی افراد نے قوانین بنائے۔ یہ تبدیلی مغلوں اور تمام مسلمانوں کیلئے تباہ کن ثابت ہوئی۔ اس تجربہ نے مختلف سطح پر اضطراب کی لہر پیدا کر دی۔ سیاسی، سماجی، قومی، زرعی و مالیاتی سطحوں پر کشاکش کا آغاز ہوا جس نے مسلم معاشرہ کو مایوس، جمود آشنا اور مضمحل بنا دیا۔ مسلم سلطنت کے استحکام کو غیر معمولی نقصان ہوا۔ حکمرانی رفتہ رفتہ اس طبقہ میں چلی گئی جس نے غیروں کے تسلط کی پختگی بنیادیں رکھ دیں اور بدلتے حالات میں وفاداریاں تبدیل کر لیں۔

ان حالات میں شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ (۱۵۶۳ء۔۱۶۲۴ء) نے اصلاح و تجدید کا عظیم الشان کام شروع کیا۔ دیندار اور باشعور حلقہ میں اصلاحی تحریک کا آغاز ہوا اسکے نتیجے میں انہیں قید و بند کی صعوبتیں اٹھانی پڑیں۔ اس تحریک کے معاون اور بہی خواہ امراء منتشر کر دئے گئے۔ مجدد موصوف پھر بھی حوصلہ نہیں ہارے تمام امکانی ذرائع سے اپنا مشن

انجام دیتے رہے۔ مجددؒ نے اپنے ایک مکتوب میں درد نہاں کا اظہار اس طرح کیا ہے

"کفار ہند بے تحاشا ہدم مساجد می نمایند و آں جا تعمیر معبد ہائے خود می سازند و نیز کفار برملا مراسم کفر بجای آرند و مسلمانان در اجرائے اکثر احکام اسلام عاجز اند۔" (مکتوبات ج ۲ مکتوب ۹۲) ہندوستان کے کفار بے تحاشا مسجدیں ڈھاتے ہیں اور انکی جگہ اپنے مندر بناتے ہیں۔ نیز کفار اعلانیہ مراسم کفر انجام دیتے ہیں جبکہ مسلمان اسلام کے اکثر احکام بجالانے سے معذور ہیں۔

اگر مجدد الف ثانیؒ کو اللہ تعالیٰ نہ اٹھاتا تو اسلام کے دشمن مسلمانوں کا شیرازہ بکھیرنے کے تمام جتن کر چکے تھے۔ لیکن اللہ کا امر سب پر غالب ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

وان اللہ موھن کید الکافرین۔ (الانفال: ۱۸) (اور بے شک اللہ تعالیٰ کفار کی تمام چالوں کو کمزور و بے اثر کر دینے والا ہے) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے کفار و مشرکین کی تمام تدبیریں ناکام بنادیں اور ایسی سازگاری بخشی کہ جس سے اسلامی تصور، عقائد و افکار کو تازہ ہوا نئی توانائی اور کاروان احیاء دین کو ایسی قوت و بصیرت عطا ہوئی کہ کفر و اسلام میں واضح امتیاز پیدا ہو گیا، احیاء اسلام کا سامان ہوا۔ اس فتنہ سے پہلے شاید اس نعمت کا ظہور ممکن نہ تھا۔

اللہ کا شکر ہے کہ اس وقت سے اب تک اعتماد کے ساتھ مسلم معاشرہ کا سفر اپنی اصل بنیادوں کی طرف جاری ہے۔ ہر چند کہ یہ سفر بہت تیز و نتیجہ خیز نہیں مگر شعور منزل کچھ معمولی دولت نہیں۔ کیا عجب اگر موجودہ فتنہ سے اللہ کی مشیت تیز روی کا سامان کرے اور ایک کمزور ملت کوئی بڑا معجزہ کر دکھائے اسلئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنی قدرت کا اظہار اسی طرح کرتا ہے۔

تجدید و اصلاح کا دوسرا دور شاہ ولی اللہؒ (۱۷۰۳ء۔۱۷۶۲ء) کا دور ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں حکومت مغلیہ کی بساط لپٹ رہی تھی۔ حدود مملکت پر سکھ، جاٹ اور مرہٹے حملہ آور تھے۔ سیاسی و معاشی غلامی کی زنجیریں افق در افق طویل و وسیع ہو رہی تھیں۔ حضرت مجددؒ کے زمانے میں فکری سطح پر ابھرنے والا فتنہ اب سماجی اور عملی صورت میں ظہور کر چکا تھا۔ شاہ ولی اللہؒ نے اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کیلئے علمی، فکری، سیاسی و اجتماعی سطح پر ایک تحریک

شروع کی۔ سیاست اجتماعیہ کے پہلو سے مغلیہ نظام حکومت کا جائزہ لیا۔ ملوکیت کی کمزوریوں اور فکر و اعتقادی گمراہیوں کو جائز کیا اور ایک حقیقی فلاحی ریاست کے خدوخال نمایاں کئے۔ قرآن و سنت سے وابستگی کی تحریک چھیڑی، تراجم، تفسیر، تعلیم و تدریس، افہام و تفہیم کا ایک مقدس سلسلہ شروع کیا۔ اکبر کا فکری و اعتقادی فتنہ سیاسی طوفان کی صورت میں مغلیہ حکومت کو نگلنے لگا تو شاہ ولی اللہؒ نے مرہٹوں سے نجات کے لئے سیاسی تحریک پیدا کی جس کے نتیجے میں احمد شاہ ابدالیؒ نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کی سرکوبی کی۔ شاہ صاحب نے شیخ احمد سرہندی کو اپنی تحریک کا امام (بانی) لکھا ہے اور خود کو اس کا مصدق بتایا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی تحریک کی اساس دین ہے۔ کتاب و سنت کو انہوں نے تمام بیماریوں، اضمحلال، عجز و ناتوانی، معاشرتی کمزوریوں کا مداوا، تمام دکھوں اور غموں کا ازالہ تجویز کیا۔ تاریخ انقلاب میں واقعہ یہ ہے کہ مذہبی اساس ہمیشہ ایک فیصلہ کن عامل (Factor) رہی ہے۔ انقلاب فرانس ایک مذہبی عالم کی تحریک سے شروع ہوا۔ اسی لئے انقلابی قوت کسی قسم کی بدنامی سے محفوظ رہی، دوراں تاریخ میں ایران اسکا بہترین مثال ہے۔

کوئی قوم اسی وقت غلامی میں مبتلا ہو جاتی ہے جب وہ ذہنی جمود اور فکری پسماندگی قبول کر لیتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ احساس و عمل کے تمام سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔ آغاز میں ایک فرد یا چند افراد کی کوششیں جہاں کافی ہو سکتی ہیں عہد زوال کے سیاسی شکنجوں میں پوری قوم کی مثالی قربانیاں اس اعجاز و تاثیر سے محروم ہو جاتی ہیں کیونکہ تمام کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ تمام دنیاوی اور معنوی و مادی اسباب اس کے خلاف ہو جاتے ہیں۔

شاہ صاحب کی فکری و سیاسی تحریک جو دینی علوم اور سیاسی اور اجتماعی ترقی کی ایک اعلیٰ اور معیاری تحریک تھی۔ ۱۸۲۶ء میں سید احمد بریلویؒ کی تحریک کی شکل میں اپنی منزل سے قریب پہنچ گئی۔ اس نے منہاج نبوت کے مطابق ایک حکومت بھی قائم کرنے میں کامیابی حاصل کر لی لیکن ۱۸۳۱ء میں اس تحریک کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ شکست دوسری بڑی مکمل

اور ہمہ گیر شکست کا پیش خیمہ بنی جس کا ظہور ۱۸۵۷ء میں ہوا۔ یہ ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں کی بدترین شکست تھی۔ فاتح سندھ محمد بن قاسم ثقفی سے عروج کی تاریخ جو شروع ہوئی تھی وہ مختلف ادوار، نشیب و فراز، تلخ و شیریں تجربات سے گزرتی ہوئی بہادر شاہ ظفر پر ختم ہو گئی۔ ۱۸۵۷ء مسلمانوں کے اخلاقی و تہذیبی زوال کی انتہا ہے۔ ادبار و نکبت کی بدلیاں اور گھٹائیں مسلم افق پر محیط ہو گئیں اور پھر تسلسل کے ساتھ ڈیڑھ سو سال تک تعذیب کی بارش برستی رہی۔ اس کے غم آلود جھونکے اب بھی خرمن ملت کو تہ و بالا کئے ہوئے ہیں۔

اسلامی فکر ہمیشہ زوال و انحطاط کے بعد عروج کا سبب بنی ہے۔ مسلمانوں نے جب بھی دینی اقدار سے شعوری وابستگی اور قرآن و سنت کے نمونہ پر کی شیرازہ بندی کی تو دوبارہ عروج کے ہم سفر بنے۔ انسانی زندگی کی تشکیل اور ملی تعمیر کے آج بھی وہی زریں اصول ہیں جن پر عمل کر ماضی میں انگنت قافلے فلاح و سعادت سے ہمکنار ہوئے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی خاکستر سے ایک جہان نو پیدا ہوا جسکو ہم تحریک دیوبند اور تحریک علیگڑھ کے نام سے جانتے ہیں۔ ان تحریکوں نے مسلم معاشرے کو ایک نئے تموج (Wave) سے ہمکنار کیا۔ فکر و عمل اور تعمیر و تشکیل کے نئے افق اور مثبت زاویے فراہم کئے۔ دیوبند نے معاشرہ کو داخلی توانائیوں سے معمور کیا۔ خارجی سطح پر علی گڑھ نے اعتماد اور سلیقہ سے جینے کا ہنر دیا۔ دیوبند نے خود شناسی و جہاں بینی کے جوہر دئے اور علیگڑھ نے جہاں بانی اور دنیا داری کے آداب سکھائے۔ مغربی استیلا نے مسلمانوں کا آخرت میں یقین بھی متزلزل کیا تھا اور دنیا میں عزت و وقار سے محروم کر کے ذلت و مایوسی سے دوچار کیا تھا۔ ہر چند کہ یہ انسانوں کی کوششیں تھیں اور دونوں پر کلام کی بہت کچھ گنجائش باقی ہے مگر یہ اعتراف نہ کرنا بے انصافی ہی نہیں احسان فراموشی بھی ہوگی کہ دونوں تحریکوں نے اپنے اپنے دائروں میں غیر معمولی خدمات انجام دیں اور ان کے بانی خراج تحسین کے بجا طور پر مستحق ہیں کہ تاریخ کے بدترین بحران میں نئے افق کے زاویے متعین کئے اور کامیابی کی شاہراہ دکھائی جب آنکھیں دیکھنے سے

اور دل بصیرت سے بڑی حد تک محروم تھے۔

ریشمی رومال اور احرار و خاکسار کی تحریکات میں بصیرت، بیدار مغزی اور حالات سے ہم آہنگ مخلص منصوبہ بندی، معلومات و امکانیات کی افسوسناک حد تک کمی بلکہ بے نیازی کا احساس جھلکتا ہے۔ فکر پر جذبات کا غلبہ ہے اور امکانات پر جوش حاوی ہے۔ خطرناک قسم کی رجائیت (Opticism) چھائی ہوئی ہے، یہاں تک کہ اقدام و شعور کا مقصد بھی غبار آلود نظر آتا ہے۔

ہجرت تحریک کے بعد خلافت، مسلم کانفرنس اور لیگ اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ فکری و عملی حیثیت سے یہ سوشلسٹ تحریک کے مشابہ ہیں۔ سوشلزم کی انقلابی تحریک انقلاب فرانس کے ردعمل کے طور پر شروع ہوئی اور ٹھہر گئی۔ دوبارہ منظم ہوئی اور شکست سے دوچار ہوئی۔ پھر روس میں تیسری بار لینن نے منظم کیا۔ اسی مناسبت سے اسکو Third International Congres کہا جاتا ہے۔ یہ ۱۹۲۱ء میں منعقد ہوئی۔

اس طرح ہندوستان میں مسلمانوں کی جدوجہد آزادی مختلف مدارج اور تحریکوں سے گزرتے ہوئے مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کی صورت میں نمودپذیر ہوئی۔ اس کو لیگ کے قائد مسٹر محمد علی جناح کا دور کہا جاتا ہے۔

برصغیر میں آزادی کی تاریخ پہلودار سیاست کی آئینہ دار ہے۔ ایک پیچیدہ، نازک اور الجھی ہوئی تاریخ ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اسکے غیر جانبدارانہ مطالعہ اور تجزیہ کا قرض ابھی باقی ہے۔ اسکی تاریخ کا المیہ یہ ہے کہ تمام مورخین فریق ہیں خواہ وہ برطانوی ہوں، کانگریسی ہوں یا مسلم لیگی، وہ اسکے ساتھ فکری طور پر انصاف نہیں کر سکتے تھے اور یہی ہوا کہ وہ انصاف نہیں کر سکے۔

برصغیر کے مسلمانوں کی آخری بڑی تحریک مسلم لیگ کی تحریک پاکستان ہے۔ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۷ء کا دور سب سے اہم ہے جس میں لیگ کی قیادت مسٹر جناح نے سنبھالی۔ بدقسمتی سے اس آخری اور فیصلہ کن معرکہ میں مسلمانوں کو معیاری قیادت نہ مل سکی۔ مسٹر جناح کو لیگی قیادت نے اگرچہ قائداعظم بنا دیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے دوایسے

چھوٹے قائد تھے جو ان کی آرزوؤں اور امنگوں کو سمجھنے اور ترجمانی کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ اسلام سے ان کی زندگی کا رشتہ کیا تھا ایک مسلمان قائد اور وہ بھی قائداعظم کے لئے بھی یہ سوال بڑا اہم ہے اور اس کا جواب شاید اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔ بہر حال اس سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو فکری و سیاسی اعتبار سے وہ تمام مسلمانوں کے لیڈر نہ تھے۔ وہ مسلم اکثریتی صوبوں کے مفادات کے لئے کام کر رہے تھے۔ انہیں باقی ہندوستان کے مسلمانوں کے حال و مستقبل کی کوئی فکر نہ تھی بلکہ وہ ان کے تئیں بڑے غیر دانشمندانہ بلکہ متشددانہ سوچ رکھتے تھے۔ مسلمانوں کا قائد ان کے تئیں اس طرح نہیں سوچ سکتا۔ بے شک وہ ایک طبقہ کے لیڈر تھے۔ مولانا آزاد گاندھیائی سیاست و فلسفہ کے زیر اثر ہونے کے باوجود ان کے جذبات عام مسلمانوں کے ساتھ دھڑکتے تھے۔ کیبنٹ مشن پلان اور مسٹر گاندھی کے نام ان کا خط جو تاریخ ہند کے ریکارڈ میں جگہ نہیں پا سکا اسی امر کا بین ثبوت ہے۔ مولانا آزاد یقیناً جناح کے مقابلے میں مسلم قائد تھے۔ ہر چند کہ ان کا عہد اور دانشوری کانگریس کی پابند تھی، بے شک برصغیر میں جو سماجی و سیاسی پیچیدگیاں پائی جاتی ہیں اس کے ذمہ دار نہرو، گاندھی اور جناح ہیں لیکن المیہ یہ ہے کہ یہ اپنی اپنی قوم میں بانی و معمار سے بلند ہو کر پیغمبری کی سطح تک پہنچا دیئے گئے ہیں، جب تک آدمی کی سطح پر لا کر ٹھیک تجزیہ نہیں ہوگا برصغیر کی روح بے قرار رہے گی۔ اس کا مداوا نہیں ہوگا اگرچہ جلد یہ ممکن نظر نہیں آ رہا۔

عروج و اقبال کا فلسفہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ایمان و علم سے وابستہ رہا ہے، علم تسخیر کا ذریعہ ہے اور ایمان اسکی معراج۔ علم و ایمان انسان کی عظمتوں کا راز ہے یہ بے فیض ہے جبکہ ظاہر نہ ہو اس کے ظہور کا نام عمل ہے۔ کسل و نفاق اس کی بیماری ہے، جمود و بے عملی اسکی موت ہے۔

ہندوستان میں علم و ایمان یکسر حجاب میں رہے ہیں اور یہی ہمارے اضمحلال، شکست و ریخت اور جبریت کا اصلی سبب ہے۔ بھارت کی روح اسکے نمود کی منتظر ہے۔ اسی بحران کی وجہ سے پاکستان منزل ناآشنا ہے اور بنگلہ دیش اسی سبب سے ناآسودہ و بے قرار ہے۔

سعید بن جبیرؒ

ترجمانی: ابو جلیس ندوی

وہ دیکھئے!

کیسا پرجوش نوجوان ہے، گٹھیلا بدن، توانا اعصاب، بھاری بھرکم ڈیل ڈول، اس کے روئیں روئیں سے زندگی کی حرارت لو دے رہی ہے۔

پھر وہ دل کا بڑا زندہ و بیدار، ذہن کا تیز و ہوشیار، نیکی و بزرگی کا دلدادہ اور گناہوں سے صد درجہ نفور و بیزار ہے۔

وہ حبشی نژاد ہے، کالا کلوٹا ہے، بال گھونگھر والے ہیں، لیکن اس کی ممتاز شخصیت پر اس کی کوئی آنچ نہیں آئی، وہ نوعمری ہی میں سرآمد روزگار ہو گیا۔

بچپن ہی میں اس نے اس حقیقت کا ادراک کر لیا کہ صرف علم ہی وصول الی اللہ کا بے خطر راستہ ہے اور تقویٰ کی راہ ہی جنت کی سیدھی راہ ہے۔

اس لئے اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں تقویٰ کو رکھا اور بائیں ہاتھ میں علم کو، پھر مضبوطی سے اپنی مٹھی بند کر لی اور یہی دو چیزیں لے کر زندگی کے سفر پر نکل پڑا۔

لوگوں نے اسے بچپن ہی میں دیکھا کہ وہ یا تو کتاب لے کر غرق مطالعہ ہے یا محراب عبادت میں کھڑا محو صلوٰۃ و مناجات۔

یہی نوجوان اپنے عہد کا سب سے بڑا مقتدر و پیشوا ہوا جسے دنیا سعید بن جبیرؒ کے نام سے جانتی اور یاد کرتی ہے۔ اللہ ان سے خوش رہے اور ان کو بھی خوش رکھے۔

انھوں نے متعدد صحابہ کرام سے علم حاصل کیا۔ ان کے اساتذہ میں ابو سعید خدریؓ، عدی بن حاتم طائیؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ، ابو ہریرہؓ، عبد اللہ بن عمرؓ اور ام المومنین حضرت عائشہؓ شامل ہیں، البتہ ان کے خاص الخاص استاد عبد اللہ بن عباسؓ تھے جو امت کے

سب سے بڑے نامور عالم دین مانے گئے ہیں۔

عبد اللہ بن عباس ہی سے انھوں نے قرآن اور اس کی تفسیر پڑھی۔ ان ہی سے حدیث و فقہ و فتاویٰ کا درس لیا، ان ہی سے زبان و ادب اور لغت کی تعلیم حاصل کی اور تمام علوم میں ایسی لیاقت و مہارت بہم پہنچائی کہ امام احمد بن حنبلؒ نے ان کے علمی تبحر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ:

"ان کی ہم عصر دنیا کا ہر شخص ان کے علم کا دست نگر ہے۔"

مزید علم حاصل کرنے کے لئے انھوں نے متعدد اسلامی ممالک کے سفر بھی کئے اور جب اپنی خواہش اور مطلوبہ معیار کے مطابق جی بھر کر تعلیم حاصل کر لی تو کوفہ کو اپنی جائے قیام بنایا، اس لئے امام کوفہ کہلائے۔

ماہ رمضان میں امامت کرتے تھے تو ہفتہ کے سات دنوں میں ہر روز الگ الگ لہجہ میں قرآن کی تلاوت کرتے، کسی دن عبد اللہ بن مسعودؓ کا لہجہ قرأت ہوتا اور کسی دن زید بن ثابتؓ کا۔ اسی طرح ہر روز لہجہ بدل بدل کر قرأہ سبعہ میں سے کسی کے لہجہ میں قرآن پڑھتے اور جب کبھی نماز کے لئے تنہا کھڑے ہوتے تو ان پر ایسی محویت طاری ہوتی کہ پڑھتے ہی چلے جاتے، دوران نماز جب وعدے اور وعید کی آیتیں آتیں تو ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے، آنکھیں برسنے لگتیں، بدن کانپنے لگتا، اسی کیفیت میں وہ آیت کو بار بار دہراتے جاتے اور سسک سسک کر روتے جاتے۔

کوفہ میں رشد و ہدایت اور علم و فقہ کے طالبین کا تانتا بندھا رہتا تھا، وہ دور دراز سے آتے اور اپنی تشنگی بجھا بجھا کر واپس جاتے۔

کوئی پوچھتا کہ، "خشیت کی حقیقت کیا ہے؟"

وہ جواب دیتے، "خشیت حقیقۃً وہ خشیت ہے جو انسان اور گناہ کے درمیان حائل ہو جائے۔"

کوئی پوچھتا کہ، "ذکر کی حقیقت سے آگاہ کیا جائے؟"

وہ جواب دیتے، "ذکر اصلاً اللہ کی اطاعت کا دوسرا نام ہے، جو شخص ہمہ دم اللہ کی جانب متوجہ رہے اور اس کی اطاعت کی راہ سے اس کے قدم نہ پھسلیں تو وہ ذاکر ہے، اور جو اللہ سے غافل ہو اور اس کی اطاعت میں بھی ڈھیلا ہو وہ ذاکر نہیں کہا جا سکتا خواہ وہ رات رات بھر تسبیح و مناجات ہی میں کیوں نہ مصروف رہے۔"

سعید بن جبیرؒ نے جس وقت کوفہ کو اپنی جائے قیام بنایا اس وقت وہ حجاج کے زیر تسلط تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب حجاج کے نام کی ہیبت سے دل کانپتے تھے، روح لرزتی تھی۔ اس نے عبداللہ بن زبیرؓ کو انتہائی بیدردی سے شہید کیا اور جہاں جہاں بنو امیہ کے خلاف شورش برپا تھی وہاں تیغ و تبر کا ایسا ظالمانہ کھیل کھیلا اور ظلم و تشدد کا ایسا بازار گرم کیا کہ بچے بچے کا دل دہل گیا اور مخالفوں کی کمر ٹوٹ گئی، اب سارا عراق اور اس سے ملحق تمام علاقے بنو امیہ کے تابع فرمان تھے۔

پھر اللہ کی مشیت کہ حجاج اور عبدالرحمٰن بن اشعث میں ٹکراؤ ہو گیا جو اموی فوج کا زبردست قائد و سپہ سالار تھا۔

رفتہ رفتہ دونوں کا ٹکراؤ فتنہ و معصیت کی ایسی بھیانک شکل اختیار کر گیا کہ امت کی تاریخ کا انتہائی الم انگیز باب بن گیا۔ یہ فتنہ ملت کے ہر خشک و تر اثاثے کو کھا گیا اور اس کے جسم میں ایسے گہرے زخم لگائے کہ صدیاں بھی انہیں مندمل نہ کر سکیں۔

ہوا یہ کہ حجاج نے عبدالرحمٰن بن اشعث کی قیادت میں ایک فوج رتبیل سے جنگ کرنے کے لئے بھیجی۔ رتبیل ترک بادشاہ تھا، اس کی بادشاہت سجستان کے عقب میں واقع تمام علاقوں پر پھیلی ہوئی تھی۔

فتح و ظفر کا ہمرکاب جانباز سپہ سالار عبدالرحمٰن بن اشعث علاقہ پر علاقہ فتح کرتا چلا گیا۔ آخر اس نے رتبیل کے تمام قلعوں پر قبضہ کر کے اموال غنیمت کا بہت بڑا ذخیرہ اندوخت کر لیا۔ اس نے فتح کی بشارت حجاج کے پاس بھیجی اور ساتھ ہی اموال غنیمت کا خمس بھی روانہ کیا جو بیت المال کا حق تھا۔

اپنی جنگی حکمت عملی کے تحت انہوں نے مشورۃً حجاج کو لکھا کہ مناسب ہو گا کہ کچھ دنوں کے لئے جنگ روک کر دشمن کی کمین گاہوں، فوجی ٹھکانوں، گھاٹیوں، دروں اور پرپیچ پہاڑی راستوں کی پوری معلومات حاصل کر لی جائے تاکہ خطرات کی دلدل میں گھرنے سے پہلے اس سے نکلنے کی راہیں اور تدبیریں فوج کی نگاہوں میں رہیں۔

حجاج نے یہ خط پڑھا تو بھڑک اٹھا، اس نے عبدالرحمٰن بن اشعث کو لکھا کہ

"تم بزدل اور کم ہمت ہو، فوج کی قیادت تم نہیں کر سکتے اس لئے دست بردار ہو جاؤ۔"

عبدالرحمٰن بن اشعث کو حجاج کا خط ملا تو اس نے فوج کے سرکردہ ذمہ داروں کو جمع کیا، انہیں خط پڑھ کر سنایا اور ان کے مشورے کا طالب ہوا۔

فوج نے ایک آواز ہو کر کہا کہ آپ اس ظالم کی بات نہ مانیں، بغاوت کر دیں، ہم سب آپ کا ساتھ دیں گے۔ عبدالرحمٰن بن اشعث نے فوجیوں سے کہا

"آپ سب میرے ہاتھ پر حجاج سے جہاد کرنے کی بیعت کریں۔ بلا استثناء تمام فوجیوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ عبدالرحمٰن اپنی فوج لے کر چلے، حجاج کی فوج سے ان کا مقابلہ ہوا، بڑی خوں ریز جنگ ہوئی، عبدالرحمٰن بن اشعث کو فتح نصیب ہوئی، ایران اور سجستان کے تمام علاقوں پر ان کا قبضہ ہو گیا۔

انہوں نے کوفہ اور بصرہ کو بھی حجاج کے ظلم و بربریت سے آزاد کرانے کے لئے اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ دونوں فوجوں میں گھمسان کی طویل جنگ ہوتی رہی اور عبدالرحمٰن کو فتح پر فتح حاصل ہوتی رہی، اسی دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے عبدالرحمٰن کو مزید قوت و طاقت بہم پہنچائی۔

ہوا یہ کہ ذمیوں کی ایک بڑی تعداد جزیہ سے بچنے کے لئے حلقہ بگوش اسلام ہو گئی اور دیہات چھوڑ کر شہروں میں آباد ہو گئی، دیہاتوں میں کاشتکاری کرنے والے لوگ بہت کم رہ گئے جس کے نتیجے میں محاصل عشر و خراج کی شرح گھٹ کے بہت نیچے آ گئی ——— اور خزانے خالی ہونے لگے۔

اس صورت حال پر قابو پانے کے لئے حجاج نے ہر شہر کے والی کو خط لکھا اور حکم دیا کہ جو دیہاتی دیہات اور کاشت چھوڑ کر شہروں میں صنعت و تجارت کرنے لگے ہیں ان کو دیہات واپس بھیج دیا جائے اور صنعت و تجارت سے ان کا رشتہ ختم کر کے انہیں زراعت اور کاشتکاری پر لگا دیا جائے۔

اس حکم کے نفاذ کی کاروائی شروع ہوئی تو بلا امتیاز ان لوگوں کو بھی شہر چھوڑ کر دیہات سدھارنا پڑا جو کئی پشتوں پہلے دیہات چھوڑ کر شہر آ گئے تھے اور یہاں اپنا کاروبار جما لیا تھا۔ جما جمایا کاروبار اور شہر کی آسودہ حال زندگی چھوڑ کر دیہات واپس جانا پڑا تو بڑی افراتفری مچی، عورتیں، بچے، بوڑھے زاروقطار رو رہے تھے، فریاد کر رہے تھے لیکن ان کی فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا، بصرہ کے تمام علماء و فقہاء نے سفارش کی، لیکن خودسر حجاج کسی کی سفارش کو کیوں خاطر میں لاتا۔

عبدالرحمن بن اشعث نے اس صورتحال کا فائدہ اٹھایا، بصرہ کے تمام فقہاء اور علماء سے اس نے درخواست کی کہ اس ظلم کو مٹانے میں وہ اس کی مدد کریں۔

تمام تابعین علماء و فضلاء نے متفقہ طور پر کھل کر عبدالرحمن بن اشعث کا ساتھ دیا، سعید بن جبیرؒ، عبدالرحمن بن لیلی، امام شعبی اور ابوالبختری ان میں پیش پیش تھے۔

دونوں فوجوں میں پھر زبردست معرکہ آرائی ہوئی، ابتدا تو عبدالرحمن کا پلڑا بھاری تھا، اس کی فوجیں غالب تھیں اور آگے بڑھتی جا رہی تھیں اور فتح بھی ان کے ہم قدم و ہم رکاب تھی۔ پھر رفتہ رفتہ حجاج کی فوجوں کا دباؤ بڑھتا گیا اور عبدالرحمن کی فوجیں پسپا ہوتی گئیں۔ حجاج کی فوجوں نے ان کی کمزوری بھانپ لی پھر چو طرفہ ایسی زبردست یلغار کی کہ عبدالرحمن کی فوجوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔

عبدالرحمن بن اشعث کسی طرح اپنی جان بچا کر فرار ہو گئے، ان کی فوجوں نے خود سپردگی کر دی۔

شکست خوردہ فوج سے حجاج نے تجدید بیعت کا مطالبہ کیا، سب نے یہ مطالبہ

منظور کر لیا لیکن بہت سارے لوگ روپوش ہو گئے۔ روپوش ہونے والوں میں سعید بن جبیر بھی تھے۔

جب لوگ تجدید بیعت کے لئے پیش ہوئے تو انہیں بڑا اچنبھا ہوا، انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ بیعت کی تجدید کے نام پر اپنے کافر ہونے کا ان سے اقرار لیا جائے گا۔ تجدید بیعت سے پہلے حجاج ہر شخص سے کہتا تھا کہ

"پہلے اس بات کا اقرار کرو کہ عہد شکنی کر کے تم کافر ہو گئے تھے۔"

جو شخص اپنے کافر ہونے کا اقرار کر لیتا اس کی جان بخشی ہو جاتی اور جو انکار کرتا اس کا سر قلم کر دیا جاتا۔

بہت سے لوگوں نے اپنے کافر ہونے کا اقرار کر کے اپنی جان بچائی لیکن بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جن کو کفر کا اقرار گوارا نہ ہوا اور وہ شہادت سے سرفراز ہوئے۔

قبیلہ خثعم کے ایک عمر رسیدہ بزرگ کو پیش کیا گیا جو غیر جانبدار رہ کر دریائے فرات کے اس پار عزلت گزیں ہو گئے تھے، حجاج نے ان سے حال پوچھا تو انہوں نے کہا:

"جنگ شروع ہوئی تو میں نے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور دریا کے اس پار سب سے الگ تھلگ ہو کر یاد الٰہی میں مصروف ہو گیا، جنگ ختم ہوئی تو تجدید بیعت کیلئے حاضر ہوا۔"

حجاج نے کہا، "اپنے امیر کے ساتھ جنگ کرنا تمہارا فرض تھا، تم نے اپنے فرض سے کوتاہی کی اس لئے اپنے کافر ہونے کا اقرار کرو۔"

اس نے کہا، "میں نے اسی سال عبادت و ریاضت میں گزارے ہیں پھر بھی اپنے کافر ہونے کا اقرار کروں تو مجھ سے زیادہ کمینہ کون ہو گا۔"

حجاج نے کہا، "پھر تو تمہارا سر قلم کر دیا جائے گا۔"

بزرگ نے کہا، "ٹھیک ہے سر قلم کر دو، یہ اس سے بہتر ہے کہ میں اپنے کافر ہونے کا اقرار کروں۔ پھر میری زندگی کے بہت تھوڑے ہی دن باقی رہ گئے ہیں، میں موت کی دہلیز پر قدم رکھ چکا ہوں، آج یا کل کی دیر ہے، اس لئے جو جی چاہے کرلے میں کفر کا اقرار

ہرگز ہرگز نہیں کر سکتا۔"

حجاج نے جلاد کو اشارہ کیا اور اس نے تلوار سے ان کی گردن قلم کر دی۔

اس بزرگ کی شہادت پر دوست اور دشمن ہر ایک کا دل رو دیا۔

اس کے بعد کمیل بن زیاد نخعی کو آواز دی گئی۔ وہ سامنے آئے تو حجاج نے کہا:

"اپنے کافر ہونے کا اقرار کر۔"

انہوں نے گرج کر کہا، "میں نہ کافر ہوں نہ کفر کا اقرار کبھی میرے لئے گوارا ہو سکتا ہے۔"

حجاج نے کہا، "غور کر کے دیکھ، جلاد سامنے کھڑا ہے، تیرا سر تن سے جدا کر دیا جائے گا۔"

کمیل نے کہا، "آج جو جی چاہے کر لے، کل اللہ کے روبرو ملے گا تو پورا حساب سادھ لوں گا۔"

حجاج نے کہا، "قتل کر دو۔" جلاد نے فوراً ان کا سر تلوار سے اڑا دیا۔

اسکے بعد ایک ایسا آدمی پیش کیا گیا جو حجاج کی اکثر برائی بیان کیا کرتا تھا، حجاج کو اس کی برائی کا علم بھی ہوتا رہتا تھا اس لئے وہ مدتوں سے اس کے خون کا پیاسا تھا، آج جب وہ سامنے آیا تو حجاج نے چمک کر کہا، "میرے سامنے اس وقت ایک ایسا شخص ہے جو اپنے کافر ہونے کا اقرار کبھی نہیں کر سکتا اس لئے اس کو قتل کر دو۔"

اس شخص نے لپک کر کہا، "حضور آپ کو دھوکا ہو رہا ہے میں تو دنیا کا سب سے بڑا کافر ہوں، فرعون اور شداد سے بھی بڑا کافر۔ حجاج کو خون جوش مار رہا تھا لیکن مجبوراً اس کو چھوڑنا پڑا۔"

اس ہولناک، سفاکی اور دہشت ناک خوں ریزی کا علم سعید بن جبیرؒ کو ہوا تو انہوں نے سوچا کہ حجاج کبھی ان پر قابو پائے گا تو ان کو بھی چار و ناچار دو باتوں میں سے ایک بات اختیار کرنی پڑے گی..... یا کفر کا اقرار یا شہادت۔ یہ سوچ کر وہ عراق سے نکلے اور چھپتے چھپاتے مکہ پہنچ

گئے، وہاں ایک دور افتادہ دیہات میں پناہ گزیں ہوئے۔

اس طرح دس سال تک انہوں نے روپوشی کی زندگی گزاری لیکن اتنی طویل مدت کے بعد بھی حجاج کے بغض و عناد کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی۔ پھر ایسا ہوا کہ بنو امیہ کا خالد بن عبد اللہ قسری مکہ کا والی ہو کر آیا۔ سعید کے تلامذہ جانتے تھے کہ وہ بڑا بد سلوک اور بد قماش ہے، انہوں نے سعید بن جبیر کو مشورہ دیا کہ مکہ چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔

سعید بن جبیر نے کہا، "ہر جگہ سے بھاگ کر میں مکہ آیا اب مکہ سے بھاگتے ہوئے مجھے اللہ سے شرم آتی ہے، اس لئے مکہ چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا چاہے جو ہو جائے۔"

لوگوں کو خالد کے بارے میں جو بدگمانی تھی وہ سچ نکلی۔ مکہ میں سعید بن جبیر کی موجودگی کا جب اس کو علم ہوا تو اس نے فوراً ان پر ایک فوج بھیج دی اور اسے حکم دیا کہ انہیں گرفتار کر کے حجاج کے روبرو پیش کر دے۔

فوج نے ان کے گھر پر چھاپا مارا، ان کو گرفتار کیا، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنائیں اور پاؤں میں بیڑیاں اور انہیں لے کر حجاج کے پاس جانے کی تیاری کی۔

انہوں نے اپنے متعلقین سے کہا، "مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اس ظالم کے ہاتھوں شہید کیا جاؤں گا۔ ایک رات اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ میں عبادت میں محو تھا، ہمیں ایسی بے خودی کی لذت ملی کہ رات بھر ہم عبادت کرتے اور اللہ سے دعا مانگتے رہے، ہم تینوں نے اس رات یہ دعا بھی مانگی تھی کہ اللہ ہمیں شہادت سے شاد کام کرے، میرے دونوں ساتھی تو شہادت کے رتبے سے سرفراز ہو چکے صرف میں باقی تھا، اب میری باری بھی آ گئی۔"

اتنی ہی بات وہ کہہ پائے تھے کہ ان کی ایک ننھی سی بچی دوڑی دوڑی آئی۔ بیڑیوں میں ان کو کسا ہوا دیکھا تو لپٹ کر زار زار رونے لگی۔ انہوں نے محبت سے اسے علیحدہ کیا اور کہا کہ بچی مت رو، جا امی سے کہہ دو کہ تو جنت جا رہے ہیں وہ بھی وہیں آئیں گی تو ملاقات ہو گی۔ یہ کہہ کر بچی کو چھوڑا اور روانہ ہو گئے۔

ایسے عابد و زاہد، متقی و خدارسیدہ عالم و امام کو لے کر فوج واسط پہنچی، انہیں حجاج

کے روبرو پیش کیا۔ حجاج نے ان کو نفرت سے دیکھا اور پوچھا، "تمہارا نام کیا ہے؟"

"میں سعید بن جبیر ہوں۔"

"سعید بن جبیر نہیں شقی بن کسیر" حجاج نے لقمہ دیا۔

"میری ماں کو تم سے زیادہ میرے نام کا علم تھا" سعید نے کہا۔

حجاج نے پھر پوچھا، "محمد ﷺ کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

سعید گویا ہوئے، "وہ افضل البشر ہیں اور افضل الانبیاء بھی، ان کا اخلاق کتاب الٰہی کا پرتو اور نمونہ تھا، امت کے لئے راتوں کو اٹھ اٹھ کر رونے والے۔"

حجاج نے کہا، "ابو بکرؓ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

سعید بولے، "وہ راست بازی اور راست گوئی کے پیکر، صدیق ان کا لقب، رسول اللہ ﷺ کے سچے جاں نشین، زندہ رہے تو سعادت ان کی زندگی کی ہم عنان رہی اور زندگی چھوڑ کر گئے تو ہر زبان پر ان کی تعریف و توصیف تھی، سنت کی شاہراہ سے ان کے قدم کبھی نہ ڈگمگائے۔"

حجاج بولا، "اچھا عمرؓ کے بارے میں تم کیا کہتے ہو۔"

سعید بولے، "وہ فاروق ہیں، حق و باطل میں فرق و امتیاز کی روشن علامت، اللہ کے پسندیدہ اور رسول ﷺ کے معتمد زندگی بھر رسول اللہ ﷺ اور ابو بکرؓ کے جادۂ حق پر قدم جمائے رکھا، ان کی زندگی ستودہ صفات اور ان کی موت شہادت۔"

حجاج نے کہا، "اچھا اب عثمانؓ کے بارے میں کچھ کہو۔"

سعید لب کشا ہوئے، "وہ شہید مظلوم، لشکر تبوک جیسی فیاضیوں کا مرہون منت، چاہ رومہ جس کی دریا دلی کا شاہکار، رسول اللہ ﷺ کے دوہرے داماد، آسمانی وحی جن کے نکاح کا سر رشتہ، ان کی فضیلت کیا پوچھتے ہو؟"

"اچھا تو علیؓ کے بارے میں بھی کچھ کہو۔"

سعید نے کہا، "ان کی فضیلت کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے

چچیرے بھائی ہیں اور ان کے داماد بھی، خواتین جنت کی سر[illegible]ہراؓ کے شوہر ہیں جو اہان جنت کے سردار حسنؓ و حسینؓ کے والد ماجد ہیں۔"

"اچھا تو بتاؤ تم خلفاء بنو امیہ میں کس کو سب سے اچھا سمجھتے ہو؟"

سعید: "وہی جسے اللہ سب سے اچھا سمجھتا ہے۔"

حجاج: "اچھا بتاؤ اللہ کس کو سب سے اچھا سمجھتا ہے؟"

سعید: "اس کا علم صرف اللہ کو ہے جو ہر ڈھکی کھلی بات کو جاننے والا ہے۔"

حجاج: "میرے بارے میں اپنی رائے بتاؤ۔"

سعید: "میری رائے سن کر تم کو تکلیف ہی ہوگی اس لئے جانے دو۔"

حجاج: "پھر بھی میں سننا چاہتا ہوں۔"

سعید: "تم کتاب الٰہی کی کھلی خلاف ورزی کرتے ہو، لوگوں کو ہیبت زدہ کرنے کیلئے بیجا تشدد کا سہارا لیتے ہو، یہ چیز تمہیں جہنم کا ایندھن بنائے بغیر نہیں چھوڑے گی۔"

حجاج: "میں تمہیں قتل کر دوں گا۔"

سعید: "تم مجھے قتل کر کے صرف میری حقیر دنیا کو بگاڑو گے، لیکن میں قتل ہو کر تمہاری ابدی زندگی کو تباہ و برباد کر دوں گا، قتل کر کے بھی تم ہی گھاٹے میں رہو گے۔"

حجاج: "اچھا بتاؤ تم کو کس طریقے سے قتل کیا جائے؟"

سعید: "اپنے قتل کے جانے کے لئے جو طریقہ تم کو پسند ہو اسی طریقے سے قتل کرو، کیونکہ تم جس طریقے سے مجھے قتل کرو گے بعینہ اسی طریقے سے اللہ تم کو آخرت میں قتل کرے گا۔"

حجاج: "اچھا بتاؤ کیا تم یہ پسند کرو گے کہ میں تم کو معاف کر دوں۔"

سعید: "اگر معافی ہوگی تو اللہ کی طرف سے ہوگی، تمہارا اس میں کوئی دخل نہ ہوگا۔"

یہ سن کر حجاج کا پارہ گرم ہو گیا وہ زور سے چلایا، "اس کو قتل کر دو۔"

یہ سن کر سعید کے ہونٹوں پر ہنسی پھیل گئی۔ حجاج کو تعجب ہوا، اس نے مسکرانے کا

سب پوچھا تو سعید نے کہا، "قادر مطلق خدا کی دشمن پر تیری جرأت و جسارت کا تماشہ دیکھ کر بے اختیار ہنسی آگئی۔"

اس نے جلاد کو حکم دیا، "فوراً قتل کر دو۔"

یہ سن کر سعید نے قبلہ رو ہو کر یہ آیت پڑھی:

انی وجہت وجہی للذی فطر السموٰت و الارض حنیفا (الانعام: ٧٩)

حجاج چلایا، "اس کا رخ قبلہ سے پھیر دو۔"

سعید نے فوراً یہ آیت پڑھنا شروع کر دی:

فاینما تولوا فثم وجہ اللہ (البقرۃ: ١١٥)

حجاج کا غصہ اور بھڑک اٹھا، کہا، "اس کو زمین پر اوندھا لٹا دو۔"

سعید فوراً یہ آیت پڑھنے لگے:

منہا خلقناکم و فیہا نعیدکم و منہا نخرجکم تارۃ اخری (طٰہٰ: ٥٥)

حجاج بڑبڑایا، "اللہ کے دشمن کو فوراً ذبح کر دو۔"

برمحل آیات کا استحضار اس سے زیادہ کسی کو نہ ہوگا۔ سعید نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کئے اور یہ دعا مانگی، "اے اللہ! میرے بعد کسی اور پر حجاج کو مسلط نہ کر۔"

سعید بن جبیرؒ کی شہادت کے ٹھیک پندرہ دن بعد حجاج بیمار ہوا، بیماری دن بدن زیادہ ہوتی گئی، مرض نے شدت اختیار کی تو اس کی نیند غائب ہو گئی۔ کبھی تھوڑی دیر کیلئے اس کی آنکھ لگتی تو فوراً اچھل کر اٹھ جاتا اور چیختا کہ، "سعید بن جبیرؒ سے مجھکو بچاؤ، وہ میرا گلا زور سے دبا رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ مجھے کیوں قتل کیا؟"

یہ کہہ کر وہ دہاڑیں مارتا اور روتا گراہتا رہتا۔ اسی عذاب میں ایڑیاں رگڑتے رگڑتے اس کی موت ہوئی۔ کچھ دنوں کے بعد کسی نے اس کو خواب میں دیکھا تو اس کا حال پوچھا۔

اس نے کہا، "ہر شخص کے بدلے میں مجھے ایک مرتبہ ہی قتل کیا گیا لیکن سعید بن جبیرؒ کے قتل کے عوض میں مجھے ستر بار قتل کیا گیا۔"

نصرانیت (٥)

انیس احمد فلاحی

اناجیل اربعہ اپنی پیشن گوئیوں کے آئینے میں

اناجیل اربعہ میں متعدد پیشن گوئیوں کا تذکرہ ہے لیکن ان کی اکثر پیشن گوئیاں غلط اور جھوٹ ثابت ہوئیں جن سے الہام کے دعوی کی مکمل تردید ہوجاتی ہے۔ ذیل میں کتاب مقدس کی چند پیشن گوئیوں کا ذکر کرکے ہم فیصلہ آپ پر چھوڑتے ہیں۔

١۔۔۔ انجیل متی میں مذکور ہے کہ مسیح کے معاصرین اپنی موت سے پہلے مسیح کو دوبارہ دنیا میں واپس آتے ہوئے ضرور دیکھیں گے۔ الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو یہاں کھڑے ہیں ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ جب تک ابن آدم کو اس کی بادشاہی میں آتے ہوئے نہ دیکھ لیں گے موت کا مزہ ہرگز نہ چکھیں گے۔" (١)

یہ نص کیسے درست ہو سکتی ہے جبکہ مسیح کے معاصرین مر گئے اور مسیح اب تک دنیا میں تشریف نہ لائے۔

٢۔۔۔ متی نے اپنی انجیل میں قیامت کی ہولناکیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے پہلی صدی مسیحی میں اس کے وقوع کی خبر ان الفاظ میں دی ہے۔ "اور فوراً ان دنوں کی مصیبت کے بعد سورج تاریک ہو جائے گا اور چاند اپنی روشنی نہ دے گا اور ستارے آسمان سے گریں گے اور آسمانوں کی قوتیں ہلائی جائیں گی۔۔۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک یہ سب باتیں نہ ہو لیں یہ نسل ہرگز تمام نہ ہوگی۔ (٢)

غور کیجیے ہم بیسویں صدی کے آخری دہائے پر ہیں اور دنیا اب تک قائم ہے مسیح کے معاصرین کب کے گزر گئے اور قیامت کا ابھی دور دور تک نام و نشان نہیں ہے۔

٣۔۔۔ اناجیل کی غلط پیشن گوئیوں میں سے یہ پیشن گوئی بھی ہے کہ جو انجیل پر ایمان لائے گا اسے نہ تو سانپ نقصان پہونچا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی زہریلی چیز۔ الخ

ملاحظہ ہوں۔ "اور اس نے ان سے کہا کہ تم دنیا میں جاکر ساری خلق کے سامنے انجیل کی منادی کرو، جو ایمان لائے اور بپتسمہ لے وہ نجات پائے گا اور جو ایمان نہ لائے وہ مجرم ٹھہرایا جائے گا اور ایمان لانے والوں کے درمیان یہ معجزے ہونگے وہ میرے نام سے بد روحوں کو نکالیں گے۔ نئی نئی زبانیں بولیں گے، سانپوں کو اٹھائیں گے اور اگر کوئی ہلاک کرنے والی چیز پئیں گے تو انہیں کچھ ضرر نہ پہونچے گا وہ بیماروں پر ہاتھ رکھیں گے تو اچھے ہو جائیں گے" (۳)

کاش کوئی مسیحی زبان کے ان ثمرات کا تجربہ کرتا، ظاہر ہے اس سے بڑھ کر اور مذاق کیا ہو سکتا ہے کوئی بھی مسیحی آج تک اپنی سیکھی ہوئی زبان کے علاوہ کسی دوسری زبان میں گفتگو کرتے ہوئے نہیں پایا گیا اور نہ ہی کسی مسیحی سے جنوں کو بھگانے اور امراض سے شفاء دینے کا عمل صادر ہوا اور نہ ہی کوئی سانپ و زہر کے اثرات سے محفوظ رہا بلکہ اس کے برعکس خود ان کا یہ اعتراف موجود ہے کہ انجیل یوحنا کے مولف کی موت زہر سے ہوئی تھی۔

سند و متن کے اعتبار سے اناجیل کے مذکورہ جائزہ سے درج ذیل نتائج نکلتے ہیں۔

۱۔ موجودہ اناجیل حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد مرتب کی گئیں ہیں۔

۲۔ ان اناجیل کی نسبت ان کے مصنفین (متی، مرقس، لوقا، یوحنا) کی جانب مشکوک ہے۔

۳۔ اناجیل کے موجودہ نسخے سب کے سب یونانی زبان میں پائے جاتے ہیں جبکہ مسیح اور انکے حواریوں کی زبان آرامی تھی۔

۴۔ اناجیل کے لکھنے والوں کے ثقافتی و علمی مہارت میں اختلاف کا واضح اثر ان کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ بیان و ترتیب اور تعلیمات میں بےحد اختلاف ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ موجودہ اناجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے حواریوں کی زندگی کے حالات اور ان کے اقوال کا مجموعہ ہیں یہ واضح بات ہے کہ سیرت کی کتاب کی حیثیت سے بھی یہ کتابیں حد درجہ غیر مکمل ہیں۔ ہمارے یہاں جرح و تعدیل کا جو لازم معیار روایت اختیار کیا گیا ہے اناجیل اس پر بھی پوری نہیں اترتیں مزید برآں انسانی آمیزش کے نتیجہ میں اس کتاب مقدس میں بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جن سے

انبیاء کرام کی عظمت اور عصمت دونوں مجروح ہوتی ہیں لہذا ان کتابوں کو ہم وہ انجیل نہیں کہہ سکتے جس کا قرآن مجید میں ہر جگہ صیغہ واحد سے ذکر کیا گیا ہے اور جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی تھی۔

اناجیل کا تنقیدی جائزہ اور مسلمان مصنفین

علماء اسلام نے آغاز سے ہی رد مسیحیت کی جانب خصوصی توجہ دی ہے اور اناجیل کا تنقیدی جائزہ لیا ہے، چنانچہ یعقوبی نے اپنی تاریخ میں اناجیل کا خلاصہ ذکر کرنے کے بعد ان کے مضامین اور قرآن مجید کے مضامین میں باہمی فرق پر بحث کی ہے۔ مسعودی نے مروج الذهب حصہ دوم میں مسیحی عقائد و بیانات کے متناقض اور مشکوک حصوں پر سخت گرفت کی ہے۔ اسی طرح البیرونی نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "الآثار الباقية" میں اناجیل اربعہ کے اختلافات و تناقضات کا مفصل تذکرہ کیا ہے اور اس دعوے کا اظہار کیا ہے کہ اناجیل اربعہ دراصل انجیل کے چار نسخے ہیں۔ ایسے ہی علامہ ابن حزم نے "الفصل فی الملل و الاهواء و النحل" میں تحریف بائبل کے متعلق بڑا قیمتی مواد فراہم کیا ہے۔ اسی طرح شہاب الدین القرافی نے "الاجوبة الفاخرة" میں ابن تیمیہ نے "الجواب الصحيح لمن بدل دين المسيح" میں، علامہ ابن قیم الجوزیہ نے "هداية الحيارى" میں، حاجی خلیفہ نے "کشف الظنون" میں اور مولوی رحمت اللہ کیرانوی مہاجر مکی نے "ازالۃ الشکوک" میں، عبدالحق دہلوی نے اپنی تفسیر "فتح المنان" معروف بہ تفسیر حقانی، میں تحریف بائبل اور مسیحی عقائد میں انحراف پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ (۴)

انجیل برناباس

برناباس کا اصل نام یوسف، لقب ابن وعظ، نسبت لاوی اور قومیت قبرصی ہے انجیل کے مصنف مرقس کا ماموں ہے نصرانیت کا داعی اول سمجھا جاتا ہے اس کی تحریر کردہ انجیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بھی عیسیٰ علیہ السلام کا بڑا گرامی منزلت حواری ہے اور نصرانی اس کا شمار ان داعیوں میں کرتے ہیں جن کی دعوتی سرگرمیاں بہت بار آور ہوئیں اور نصرانی مذہب کو ان سے تقویت حاصل ہوئی۔ اس کی یہ قربانی یاد رکھے جانے کے لائق ہے کہ اپنی تمام جائداد بیچ کر اس نے دعاۃ و واعظین کے نظم و انصرام کا بیڑا اٹھایا۔ (۵)

یہ کارنامہ بھی اسی کا ہے کہ جب حواری شاؤل یعنی (پولس) سے ڈرتے تھے تو اس نے رام کرکے اس کو حواریوں کی خدمت میں بھیجا تھا (۶) پھر دعوتی جدوجہد کے کچھ ایام کے بعد برناباس سے اس کا اختلاف ہوا اور دونوں علیحدہ ہو گئے۔ (۷)

انجیل برناباس کا تاریخی پس منظر

سب سے پہلے اس کا چرچا اس وقت ہوا جب سن ۴۹۲ء میں پاپائے اعظم جلاسیوس نے چند کتابوں کے مطالعہ کو ممنوع و حرام قرار دیا ان ممنوعہ کتابوں میں برناباس کی انجیل بھی تھی۔ یہ بعثت نبوی سے پہلے کا واقعہ ہے۔ پھر سولھویں صدی عیسوی کے اواخر تک ان کے حالات و واقعات پر پردہ پڑا رہا۔ یہاں تک کہ ایک لاطینی راہب فرامرینو کو آریتوس بشپ کے ان رسائل کی معلومات حاصل ہوئی جن میں انھوں نے پولس کی مذمت کی تھی۔ بشپ آریتوس نے اس مذمت و تردید کو برناباس انجیل کی جانب منسوب کیا تھا اس لیے اس راہب کو برناباس انجیل کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اتفاق کی بات کہ وہ پوپ اسکٹس پنجم کا منظور نظر ہو گیا۔ ایک دن اس کے ساتھ اس کے کتب خانہ میں جانے کا اس کو موقع مل گیا وہاں پوپ کو نیند آگئی اور وہ سو گیا۔ اب وقت گزارنے کے لیے فرامینو اس کے کتب خانہ کا جائزہ لینے لگا اسی دوران وہ کتاب اس کے ہاتھ لگی۔ اس نے اس کتاب کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر چھپایا پوپ بیدار ہونے تو اجازت لیکر باہر آیا با تمام شوق اس کا مطالعہ کرنے لگا۔ پھر اس کے بعد اس نے اسلام قبول کر لیا۔ مستشرق سیل نے اپنے ترجمہ قرآن کے مقدمہ میں یہ معلومات درج کی ہیں اور بتایا ہے کہ مصطفی عرندی نے یہ واقعہ ہسپانوی نسخہ کے دیباچہ میں تحریر کیا ہے۔

پھر سن ۱۷۰۹ء میں روس کے شاہی مشیر کریمر کو اٹلی میں ایک نسخہ کا پتہ چلا وہ اس وقت ایمسٹرڈم کے کسی صاحب حیثیت آدمی کے یہاں مقیم تھا اسی کے کتب خانہ میں یہ نسخہ اس کو ملا۔ کریمر نے یہ نسخہ شہزادہ ایوجین سافوی کو تحفہ کے طور پر دے دیا کیونکہ وہ علمی نوادرات اور تاریخی آثار کا بڑا دلدادہ تھا۔ پھر سن ۱۷۳۸ء میں شہزادہ کے کتب خانہ کے ساتھ یہ نسخہ بھی آسٹریا کے پایہ تخت وانا کے شاہی کتب خانہ میں ہو گیا اور اب تک وہیں ہے۔ اسی سے ڈاکٹر مشکوس نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا پھر لبنان کے ایک عیسائی ڈاکٹر خلیل سعادت نے اس کا عربی ترجمہ کیا جسے علامہ رشید رضا مصری نے

سن ۱۹۰۸ء میں اپنے ایک مقدمہ کے ساتھ شائع کر دیا۔ یہ عربی ترجمہ جب ہندوستان میں پہونچا تو مولوی محمد حلیم صاحب انصاری ردولوی نے اس کا اردو ترجمہ کیا جو سن ۱۹۴۸ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اس کا ایک دوسرا نسخہ اسپین میں ہے اٹھارہویں صدی کے اوائل میں اس کا علم ہوا۔ گمان غالب ہے کہ یہ اسی والے نسخہ کی نقل ہے یہ نسخہ ہیلی کے مقام پر ڈاکٹر ہلمس کو ملا تھا۔ انھوں نے اسے ہدیۃً ڈاکٹر سیل کو دے دیا۔ انھوں نے اس کے ترجمہ کے ساتھ یہ نسخہ آکسفورڈ یونیورسٹی (برطانیہ) کے مشہور استاذ ڈاکٹر ہوایت کو پیش کر دیا۔ یہ نسخہ مع ترجمہ انہیں کے پاس مقیم رہا۔ ڈاکٹر خلیل سعادت نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر ہوایت کے اسباق میں اس نسخہ کے بہت سے ٹکڑے پائے جاتے ہیں۔ (۸)

یہ انجیل منظر عام پر آئی تو عیسائی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی کیونکہ اس میں جو معلومات تھیں وہ ان کے عقائد کے منافی تھیں۔ انھوں نے مختلف ذرائع سے اس کے دفاع کی کوشش کی۔ ایک بات تو انھوں نے یہ کہی کہ یہ کسی عرب مسلمان یا اندلسی یہودی کی تالیف ہے جو عیسائی ہونے کے بعد پھر مسلمان ہو گیا۔ ڈاکٹر سعادت نے نصرانیوں کے اس دعوی کی دو دلیلیں پیش کی ہیں۔

۱۔ برناباس کے اصلی نسخہ پر بعض عربی حاشیے پائے جاتے ہیں۔
۲۔ اس کتاب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی پیشین گوئیوں میں آپ کے حلیہ اور صفات کے تذکرہ کے بجائے صاف صاف نام کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

پہلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ اسی کے نسخہ پر بعض عربی حواشی کی موجودگی صرف اس امر پر دلالت کرتی ہے جن لوگوں نے اس نسخہ کو پڑھا ہے ان میں کوئی عربی زبان سے بھی واقف رہا ہوگا اور عربی زبان سے اس کی واقفیت بھی سطحی اور سرسری سی رہی ہوگی کیونکہ حواشی پر موجود عربی جملے بے شمار نحوی و صرفی غلطیوں سے پر ہیں۔ کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ حواشی پر موجود بعض عربی عبارتوں کو اس کتاب کے مؤلف کے مسلم ہونے پر بطور دلیل وشہادت کے تو پیش کیا جائے لیکن پورے متن کے اسی زبان میں ہونے کے باوجود اسے کسی مسیحی عالم کی تصنیف نہ مانا جائے۔ (۹)

رہی دوسری دلیل تو وہ بھی درست نہیں ہے، کیونکہ بائبل میں کئی عظیم الشان پیغمبروں کی آمد کی پیشین گوئی ان کے نام ولقب کو بتا کر کی گئی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ کتاب یسعیاہ میں حضرت شعیاہ علیہ السلام کی زبانی حضرت مسیح علیہ السلام کے سلسلہ میں یہ پیشن گوئی کی گئی ہے "دیکھو ایک کنواری حاملہ ہو گی اور بیٹا پیدا ہو گا اور اس کا نام عمانوائیل رکھے گی" (۱)

۲۔ زبور میں ہے "قومیں کس لیے طیش میں ہیں؟ اور لوگ کیوں باطل خیال باندھتے ہیں خداوند اور اس کے مسیح کے خلاف؟" (۲)

عیسائی حضرات کے نزدیک اس عبارت میں مسیح سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ (۳)

۳۔ کتاب دانیال میں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لقب کے ساتھ آپ کی مدت بعثت بھی بیان کر دی گئی ہے "اور باسٹھ ہفتوں کے بعد وہ ممسوح قتل کیا جائے گا اور اس کا کچھ نہ رہے گا" (۴)

ان تمام حوالوں سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اگر آنے والی شخصیت عظیم الشان و عظیم المرتبت ہو تو بعض اوقات پیشن گوئی میں اس کا نام بھی ذکر کر دیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں کتب احادیث میں بھی آخری زمانے میں آنے والے مہدی علیہ السلام کے نام و لقب کا تذکرہ بالتفصیل موجود ہے۔ (۵) یہ امر قابل لحاظ ہے کہ برناباس کا موجودہ نسخہ اصل نسخہ نہیں بلکہ اس کا ترجمہ ہے اور ہو سکتا ہے کہ مترجم نے تلمیح و کنایات کے انداز میں موجود بشارتوں کے لیے موزوں تعبیر نہ پا کر ان کے مفہوم و مدعا کو صراحتاً بیان کر دیا ہو جیسا کہ عموماً مسیحی حضرات عبرانی کتابوں کے ترجمہ میں ایسا کر دیتے ہیں۔ (۶)

مختصر یہ کہ یہ کسی مسلمان کی تصنیف نہیں ہو سکتی کیونکہ ــــ

(۱) ــــ کسی مسلمان کو کیا پڑی ہے کہ وہ نصرانیوں کے لیے کوئی کتاب لکھے۔ پھر مسلمان ہو کر وہ اختراع و بہتان اور دروغ و باطل کا افسانہ تخلیق کرے۔

(۲) ــــ حیات مسیح سے متعلق اس میں ایسی معلومات ہیں جو یہودیوں اور نصرانیوں میں نہیں پائی جاتیں۔

(۳) ــــ اس کتاب کے عربی مترجم نے بیان کیا ہے کہ اس انجیل کا مصنف عہد نامہ قدیم اور نصرانیت کے بارے میں اتنی وسیع معلومات رکھتا ہے کہ بڑے بڑے عیسائی علماء جو دین کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر چکے ہیں وہ بھی اتنی نہیں رکھتے۔ اگر یہ بات ایسی ہے تو اس کو مسلمان کیسے باور کیا جائے۔ کیا ایک مسلمان کو عیسائی علماء و محققین سے

زیادہ نصرانیت کا علم ہو سکتا ہے۔ (۷)

(۴) ــــ اس میں ایسی غلطیاں ہیں جن کو کسی مسلمان سے منسوب کرنا بداہۃً غلط ہے۔ مثلاً اس میں ہے کہ آسمان نو ہیں۔ اسی طرح میکائیل اور میکائیل کے نام میں بھی اختلاف ہے اور اسرافیل کی جگہ اوریل لکھا ہوا ہے اور بعض مقامات پر ایک فرشتہ کا نام رفائیل دیا ہے جس سے اسلامی ادب بالکل ناآشنا ہے۔

(۵) ــــ اس کتاب میں رفع مسیح کے بعد تھوڑی دیر کے لیے دوبارہ دنیا میں تشریف لانے اور دین و سیاست کی تفریق کا خالصتاً غیر اسلامی نظریہ بھی پایا جاتا ہے (۹)۔ ظاہر ہے اگر یہ کسی مسلمان موحد کی تصنیف ہوتی تو مذکورہ بالا عقائد کا اس میں ذکر نہ ہوتا۔

بہر حال یہ کتاب عیسائی فضا و ماحول کی پیداوار ہے اور اپنی زبان و طرز تحریر کے اعتبار سے بھی وہ عیسائی ہی ہے۔ اگر یہ کسی مسلمان کی تصنیف ہوتی تو ناممکن تھا کہ صدیوں تک کسی مسلمان کو اس کی ہوا تک نہ لگے۔ جبکہ مسلمان علماء شروع سے ہی عیسائیت کی تردید میں پیش پیش رہے ہیں اور خصوصاً ایسے امور و تحقیقات کی جستجو میں تو وہ ہمیشہ لگے رہتے تھے۔ لیکن عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہونے والے کسی مناظرہ میں کسی مسلم دانشور نے اس کتاب کا حوالہ کبھی نہیں دیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے عیسائیوں کا مذکورہ بالا دعویٰ غلط ہے۔

کتاب کے اہم مباحث و حقائق

عیسائی اس انجیل کی تردید اس لیے کرتے ہیں کہ انجیل، اناجیل اربعہ سے درج ذیل بنیادی امور میں مختلف عقیدہ بیان کرتی ہے۔

(۱) ــ یہ انجیل اعلان کرتی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نہ اللہ کے بیٹے ہیں اور نہ خدا بلکہ وہ صرف ایک انسان ہیں۔ مسیح کا اللہ کا بیٹا یا خدا ہونا، یا ختنہ نہ کرنا اور سور کا گوشت کھانا وغیرہ پولس کے تراشے ہوئے الزام و بہتان ہیں۔ ان ہی الزامات کی تردید اس کتاب کا سبب تالیف ہے۔ (۲۰)

(۲) ــ اس میں حضرت مسیح علیہ السلام نے بتایا ہے کہ وہ مسیح یا مسیا جس کی بشارت عہد نامہ قدیم کے صحیفوں میں دی گئی ہے اس سے مراد میں نہیں ہوں بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ (۲۱)

(۳) ــ ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں نہ کہ حضرت اسحاق علیہ السلام، جیسا کہ ان کا

عقیدہ ان کی کتابوں میں مذکور ہے۔

(۴)۔۔عیسیٰ علیہ السلام کو سولی نہیں دی گئی بلکہ انھیں آسمان پر اٹھالیا گیا۔ جسے سولی دی گئی وہ یہوذا اسخریوطی ہے جسے حضرت مسیح علیہ السلام کا ہم شکل بنادیا گیا تھا۔ اسی وجہ سے تلامذہ کو یہ شبہ ہو گیا کہ جس کو سولی دی گئی ہے وہ مسیح ہی ہیں تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے مسیح کو ان کا شک دور کرنے کے لیے اتارا۔ پھر انھوں نے اپنی ماں کو اور تلامذہ کو بتایا کہ وہ باقی ہیں اور دنیا ختم ہونے تک باقی رہیں گے۔ وہ تین دن ان کے ساتھ رہے پھر آسمان پر اٹھالیے گئے۔ (۲۴)

اس کتاب کے یہی وہ مباحث و حقائق ہیں جن سے عیسائی حلقوں میں کھلبلی پیدا ہوئی جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تو وہ اس کتاب کے تعلق سے پس و پیش کا شکار اس لیے نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب حق ان کو عطا فرمائی ہے وہ اسی کتاب سے حق کو پرکھتے تولتے ہیں اور اسی کتاب کی روشنی میں حق کا چہرہ صاف دیکھ لیتے ہیں۔ اور اس کتاب کا حال یہ ہے کہ نہ اس کی کوئی سند ہے نہ تاریخ، پھر وہ ایک ایسے شخص کی تالیف ہے جو بہر حال معصوم نہیں ہے، اس سے خطا و غلطی بھی ہو سکتی ہے اور بھول بھی۔ اور وہ حق سے بیگانہ بھی ہو سکتا ہے اس لیے اس کتاب کو یہ حیثیت نہیں دی جا سکتی ہے کہ دینی عقیدہ کی اسے بنیاد بنایا جائے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی حیثیت دی جا سکتی ہے تو وہ تاریخی و ادبی حیثیت ہے اور بس۔ البتہ عیسائیوں کے تعلق سے یہ بات کہی مناسب ہوگی کہ عیسائی حضرات کے وہ اصول تنقید جنھوں نے بائبل کو نہ صرف قابل اعتماد بلکہ الہامی قرار دیا، سو انھی کی روشنی میں انجیل برنباس بھی قابل اعتبار ٹھہرتی ہے بلکہ بائبل سے کہیں زیادہ کیونکہ جتنی خارجی اور اندرونی شہادتیں اس کتاب کی اصلیت پر دلالت کرتی ہیں اتنی شاید ہی بائبل کی کسی کتاب کو حاصل ہوں۔

حواشی

(۱) انجیل متی ۲۶/۱۴
(۲) یوحنا ۳/۲۵، ۲۲
(۳) انجیل مرقس ۱۴/۱۰-۸
(۴) دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۳/۴-۲۱۹

بقیہ صفحہ [illegible] پر

ذکر جلیلؒ (۲)

عبدالرب اثری فلاحی

معاش اور تدریس

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں پر جو کچھ بیتی ہے وہ بڑی المناک کہانی ہے۔ تحریک حریت کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کے اجتماعی اداروں خصوصاً مدارس اور علماء پر جیسی کچھ افتاد پڑی ہے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ ہر شخص اس سے بخوبی واقف ہے۔ اسلامی نظام میں علماء قائد و رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں غیر اسلامی اور بے رحم تمدن میں ان کی حیثیت بہتر نہیں ہو سکتی۔ مولانا بھی اسی عہد زوال کی پیداوار تھے۔ مولانا کے ساتھ ایک اجنبی تہذیب نے ہی ستم نہیں کیا بلکہ اپنوں نے بھی بڑے مظالم ڈھائے۔ لیکن تعجب ہے کہ مولانا زمانہ طالب علمی میں معاشی مستقبل کے سوال پر کبھی پریشان نہیں ہوئے جبکہ عام طور پر دینی تعلیم حاصل کرنے والے نوجوانوں کو سب سے زیادہ یہی سوال پریشان رکھتا ہے۔ اور یکسو نہیں ہونے دیتا، صرف ایک مرتبہ درس بخاری کے درمیان یہ وسوسہ دل میں اتر گیا کہ اب اس کے بعد کیا کرنا ہے۔ پیٹ کا کیا بندوبست ہو گا۔ بار بار یہ سوال ابھرتا رہا اور شدت و قوت کے ساتھ ابھرتا رہا، جذبہ دروں نے کہا، یہی کر کیوں نہ طب کر لیں؟ یہ فن باوقار بھی ہوتا ہے اور بالا نشیں بھی لیکن مولانا کا ضمیر پکار اٹھا کہ "نہیں" "آپ براہ راست دینی خدمت کی راہوں میں سے کسی راہ پر لگیں"۔ کشمکش جب حد سے بڑھی تو مولانا نے اپنے شیخ، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا۔ انھوں نے استخارہ کا مشورہ دیا۔ اس کی ترکیب بھی بتائی۔ سلف صالحین کے اور اپنے تجربے بھی سنائے۔ چنانچہ اس پر آپ نے عمل کیا۔ تیسرے دن مولانا نے خواب دیکھا کہ ایک سفید ریش بزرگ ایک کتاب ہاتھ میں لیے ہوئے ہیں۔ مولانا نے ان سے کتاب مانگی۔ انھوں نے دے دی۔ جب مولانا نے کتاب کھولی تو بہت موٹے حرفوں میں لکھی ہوئی یہ عبارت صفحہ کی پہلی سطر میں نظر کے سامنے تھی۔

"لا ینبغی لعالم الدین ان یشتغل بالتجارۃ او الزراعۃ او الحیاکۃ فان ھذا ضیاع للعلم" عالم دین کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنا وقت تجارت، زراعت یا بنائی کے کاموں میں لگائے کیونکہ یہ علم کا ضیاع ہے۔

عبارت پر نظر پڑتے ہی مولانا کی نیند کھل گئی اور حال یہ تھا کہ ذہن بالکل

یکسو ہو چکا تھا۔ طب کا خیال زائل ہو چکا تھا۔ مولانا کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور پھر تعلیم و تعلّم کے پیشے سے اپنے کو منسلک کرنے کی ٹھان لی، تاحیات اسی راہ پر گامزن رہے۔

ندوۃ العلماء سے فراغت[1] کے بعد آپ کے بعض اساتذہ کی خواہش تھی کہ آپ مدینہ (لکھنؤ) میں یا ندوہ کے کسی عربی ترجمان میں کام کریں۔ لیکن یہ پیشہ آپ کی طبیعت سے میل نہیں کھا رہا تھا اور رجحان تعلیم و تدریس کی طرف تھا۔ نتیجۃً مولانا ناظم ندویؒ کی کوششوں سے مدرسہ اشاعت العلوم بریلی آ کر مدرس ہو گئے۔ یہاں پر آپ عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھاتے تھے اور ادب و انشاء کے کچھ گھنٹے لیتے تھے۔

مولانا اپنے نام کے ساتھ جیسا کہ ان کا بیان ہے ندوی نہیں لکھتے تھے مگر وہاں کے کچھ اہل علم جن کا تعلق سہارنپور دیوبند سے تھا ندوہ کا نام کسی قدر تحقیر سے لیتے تھے۔ اور جب مولانا کے متعلق دریافت کیا جاتا کہ کہاں کے پڑھے ہوئے ہیں تو بھی کسی قدر تخفیف کے انداز میں کہا جاتا کہ ندوہ میں پڑھا ہے۔ اس کے بعد مولانا مستقل طور پر ندوی لکھنے لگے اور اس نسبت کے ساتھ مقبولیت بڑھتی گئی۔ اسی زمانہ میں چونکہ جماعت کے رکن ہو چکے تھے، اور جماعت نے اپنے لٹریچر کو اردو سے عربی میں منتقل کرنے کے لیے "دار العروبہ" کے نام سے ایک شعبہ قائم کر لیا تھا۔ چنانچہ مولانا بھی اس ادارے کے ایک رکن متعین کیے گئے۔ لیکن مولانا سب کام یہیں رہ کر کرنا چاہتے تھے۔ پھر مولانا مودودیؒ نے مولانا کو خط لکھا کہ ایک مصری انجینئر جو کہ جماعت کے ہمدرد ہیں وہ عربی سیکھنا چاہتے ہیں کیا آپ آ سکتے ہیں؟ مولانا نے حامی بھر لی اور دار السلام (مرکز جماعت

---

(۱) مدیر مجلہ "الایمان" دیوبند، نومبر ۱۹۹۱ء ص ۴۸ پر رقم طراز ہیں کہ "مولانا شاید ندوی ایک مدت کے لیے بھی نہیں تھے۔ کیونکہ مولانا جب دیوبند سے ندوہ صرف ادب کی تعلیم کے لیے آئے تو معلوم ہوا کہ یہاں ادب کے طالب علم کی حیثیت سے داخلہ کا اس وقت کوئی قانون نہیں تھا۔ مستقل کوشش کے باوجود ناکام رہے تو یہ شکل نکلی کہ مدرس ہو کر استفادہ کریں۔ لیکن مولانا آمادہ نہ ہوئے تو پھر ایک استاذ کی سفارش پر مدرسہ "اشاعت العلوم" بریلی چلے گئے۔ ۱۹۷۵ء میں جب ندوہ کا پچاسی سالہ جشن منایا جا رہا تھا تو مولانا علی میاں نے مولانا کو بھی دعوت دی اور اس میں یہ لکھا کہ "ہماری اور آپ کی ندویت یکساں ہے یعنی تعلیم تو حاصل نہیں کی لیکن ندوی کہلاتے ہیں۔"

اسلامی) پہونچ گئے۔ وہاں پر رہ کر چند کتابوں کا ترجمہ بھی کیا خاص کر "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" جو کہ ایک انقلابی کتاب ہے، کا ترجمہ آپ ہی نے کیا تھا۔ پھر جماعت کی درسگاہ سے منسلک طلبہ، انجینئر صاحب، پروفیسر غفور احمد صاحب، ڈاکٹر خورشید احمد صاحب وغیرہ نے آپ سے خوب خوب کسب فیض کیا۔ اور آپ نے خود مولانا امین احسن الاصلاحی صاحب سے جو کہ اسی دوران غالباً ۱۹۴۷ء میں پاکستان گئے تھے استفادہ کیا۔ لیکن وہاں کی آب و ہوا راس نہیں آئی اور صرف ڈیڑھ دو سال کے قلیل وقفے کے بعد وہاں سے لوٹ کر بریلی ہی کی ایک دوسری مایہ ناز درسگاہ "مصباح العلوم" میں آ گئے یہ وہ اہم مدرسہ ہے جس میں مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری بھی رہے، مولانا اشرف علی صاحب بھی رہے اور دیگر بڑے بڑے اکابرین بھی رہے۔ مولانا اس ادارے میں اس وقت کے صدر مدرس اور مشہور محدث مولانا عبد القیومؒ اور دوسرے مولانا عبد الحفیظ بلیاویؒ کی تحریض و تشویق پر آئے تھے۔ مولانا یہاں عربی ادب کی ابتدائی کتابیں پڑھاتے تھے، انشاء کراتے اور قرآن کا ترجمہ و تفسیر بھی پڑھاتے تھے۔ عصر کی نماز کے بعد مولانا بریلی کے ٹاؤن ہال، موتی پارک میں ٹہلنے جاتے، یہاں پر بھی طلبہ آپ کو گھیرے ہوتے تھے۔ مولانا دیوبندی طرز فکر کے مدرسے میں استاذ تھے مگر موتی پارک میں بریلوی طرز فکر کے طلبہ جمع ہوتے اور ادب و انشاء سیکھتے کھل کر ہر موضوع پر تبادلۂ خیال کرتے اور عام درس نظامیہ سے مختلف پا کر مزید گرویدہ ہوتے جاتے نام آتا تو سراپا ادب و احترام بن جاتے۔

مدرسہ "مصباح العلوم" کی خستہ حالی کے بعد مولانا سرائمیر آ گئے اور یہاں کے ممتاز علمی و تربیتی مرکز "مدرسۃ الاصلاح" میں مدرس ہو گئے۔ یہاں آئے تو استاذ بن کر لیکن خالی گھنٹیوں میں وہ طالب علموں کے ساتھ مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کے درجے میں بیٹھتے اور نہایت انکساری کے ساتھ مولانا سے قرآن پڑھتے، آپ کو یہاں صرف کی کتاب پڑھانے کو ملی جو کہ درس نظامیہ کے طریقے سے یکسر مختلف تھی۔ لیکن اس کو نہایت محنت اور خوش اسلوبی سے نبھایا۔ اسی طرح قرآن کا سبق پڑھانے کے لیے عربی سوم کا کورس طلب کیا لیکن مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کے یقین دلانے کے بعد کہ وہ مدد کریں گے اونچے درجات میں قرآن پڑھانے لگے۔ شروع میں بہت پریشان ہوئے اور مولانا مرحوم بھی معاملے کو طول دیتے رہے۔ لیکن جب دیکھا کہ واقعی لگن اور شوق ہے تو پھر رہنمائی بھی کی اور مستفید بھی کیا۔ استفادے کے اس موقع نے مولانا کو واقعی قرآن کا طالب بنا دیا

ان کو قابل رشک حد تک قرآن سے عشق ہو گیا اور قرآن پر غور و فکر ان کا محبوب مشغلہ بن گیا۔

پھر جب جماعت اسلامی ہند نے عصری تعلیم یافتہ افراد کے لیے خصوصی طور کا اہتمام کیا اور درسگاہ اسلامی میں ثانوی درسگاہ کے نام سے ایک الگ شعبہ و نصاب تیار کیا۔ پورے ملک سے منتخب افراد جو کہ اس میں دلچسپی رکھتے تھے وہاں اس خصوصی نصاب کی تکمیل کے لیے آنے لگے۔ جس میں ڈاکٹر فضل الرحمان فریدی صاحب، عبدالرشید عثمانی صاحب وغیرہ جیسے اہم مشاہیر شامل ہیں۔ ان میں تعلیم دینے کے لیے جماعت نے اپنے باصلاحیت ارکان جماعت کی خدمات حاصل کیں۔ تو مولانا مرحوم کو بھی مدرسۃ الاصلاح سے ثانوی درسگاہ مرکز جماعت اسلامی ہند رامپور بلالیا۔ اور آپ وہاں قرآن، دیوان الحماسۃ و سبع معلقات کا درس دینے لگے۔ لیکن مختلف اسباب کی وجہ سے یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری رہ سکا۔ جب ثانوی درسگاہ ختم ہوئی تو مولانا کو شعبہ تصنیف میں لے لیا گیا۔ لیکن مولانا نے محسوس کیا کہ کچھ لکھنے کا روز موڈ نہیں بنتا ہے۔ اور تنخواہ روز کی ملتی ہے۔ ان کے اس احساس جوابدہی اور احتیاط نے ان کو جلد ہی شعبہ تصنیف سے استعفاء دینے پر مجبور کردیا۔ آپ استعفاء دیکر پھر دوبارہ مدرسۃ الاصلاح آگئے۔ لیکن جلد ہی ۱۹۶۲ء میں وہاں ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ تمام وابستگان تحریک کو وہاں سے سبکدوش کر دیا گیا۔ مولانا بھی سبکدوش ہو کر گھر آگئے اسی اثناء سابق امیر حلقہ مغربی بہار جناب انیس الدین احمد مرحوم نے درسگاہ اسلامی کے انداز پر ایک مدرسہ "جامعہ کاشف العلوم" کے نام سے چتر پور ہزاری باغ، بہار میں قائم کیا جس کا نصاب مولانا نے ہی ترتیب دیا تھا۔ اس لیے اس میں رنگ بھرنے کے لیے بھی مولانا کو وہاں بلالیا۔ مولانا وہاں گئے اور تحریکی مقصد کو بروئے کار لانے لیے جو نصاب ترتیب دیا تھا اس میں رنگ بھرنا شروع کیا۔ ابھی اپنی منزل کے ابتدائی مرحلے ہی میں تھا کہ بہتیرے معاونین نے تعاون سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کے باوجود اس کو آگے لیکر چلتے رہے۔ ادھر جامعۃ الفلاح بھی انہیں مناہج و مقاصد کو لیکر منزلیں طے کر رہا تھا۔ مولانا کی صلاحیت کا بہترین استعمال یہاں ممکن تھا لہذا یہاں کے ذمہ داران نے بصد اصرار دعوت دی تو اپنے شاگردوں سمیت ۱۹۶۴ء کے اواخر میں جامعۃ الفلاح تشریف لے آئے۔ اور صرف چند استثنائی مہینوں کے علاوہ تاحیات جامعہ میں ہی رہے۔

اوائل ۱۹۷۲ء میں بعض نامعلوم وجوہ سے یہاں سے جامعہ ارشاد گئے لیکن وہاں کا ماحول راس نہ آسکا اور سابق امیر حلقہ آندھرا پردیش مولانا عبدالرزاق لطیفی مرحوم کی دعوت پر جامعہ "دارالہدیٰ" محمد نگر، آندھرا پردیش چلے گئے۔ لیکن جب ذمہ داران جامعہ کا بہم اصرار بڑھا تو چند شرائط کے ساتھ دسمبر ۱۹۷۲ء میں جامعہ تشریف لے آئے۔ اور پوری زندگی یہیں گذار دی۔

اخلاق و فضائل

مولانا علم و فضل اور جلالت قدر کے اعلیٰ مناصب پر فائز تھے اور وقت کی عظیم شخصیتیں ان کی مداح و ثناخواں تھیں اور بے تکلف ان کے بلیغ علم و حکمت سے خوشہ چینی کرتی تھیں۔ مولانا کی شخصیت باکمال، سحر آفریں اور دل آویز تھی، وہ تنہا ایک فرد نہ تھے بلکہ اپنی ذات میں ایک عظیم ادارہ اور ایک عظیم ادارے کی جان تھے۔ مولانا کے اخلاق و کردار سے تو سبھی متاثر تھے۔ انکی نیک نفسی، سادگی، خدا ترسی اور قناعت کے تو سبھی قائل تھے۔ مولانا علمی حیثیت سے بھی، صلاحیت و قابلیت کے لحاظ سے بھی، وسعت و جامعیت کے اعتبار سے بھی بلند پایہ انسان تھے۔

احتیاط و تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ ثانوی درسگاہ سے جب شعبہ تصنیف میں لے لیا گیا اور مولانا نے یہ محسوس کیا کہ روزانہ لکھنے کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی، تنخواہ روز کی ملتی ہے تو ان کے احساس تقویٰ اور احتیاط نے جلد ہی شعبہ تصنیف سے استعفاء دینے پر مجبور کردیا۔

مولانا بچوں کے لیے بہت ہی شفیق و مہربان تھے۔ طلبہ ان سے بہت مانوس تھے۔ وہ بھی طلبہ اور ان کے مسائل میں دلچسپی لیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کسی بچے کو کوئی تکلیف یا پریشانی ہوتی تو بے تکلف مولانا کے پاس پہنچ جاتا۔ مولانا اس سے بڑی محبت و شفقت سے پیش آتے طلبہ کے مسائل اور شکایات پوری توجہ اور سنجیدگی سے سنتے یہاں تک کہ ان کے گھریلو اور ذاتی معاملات میں بھی مفید مشوروں سے نوازتے رہتے۔ طلبہ سے لگاؤ کا ایک بہترین نمونہ یہ واقعہ ہے کہ "جامعۃ الفلاح کے ایک طالب علم کو بستی کے ایک آدمی نے مار پیٹا۔ مولانا کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے اس وقت کے ناظم کے نام ایک رقعہ بھیجا کہ "مجھے فلاں شخص نے مارا ہے" یہ رقعہ پا کر ناظم صاحب جس حال میں تھے اسی حال میں بھاگتے ہوئے جامعہ چلے آئے اور مولانا سے ملے۔ مولانا نے پوری بات

ان کے سامنے رکھی، چنانچہ اسی دن شام کو بستی والوں کی ایک میٹنگ ہوئی اور متعلق فرد کی سرزنش کی گئی۔

(ہفت روزہ دعوت دہلی ۲۲ تا ۲۹ اگست ۸۷ء)

ایک طالب علم کی پٹائی کو اپنی پٹائی تصور کرنا اپنے طلبہ سے استاد کی شفقت کا کیسا بے مثل و عملی نمونہ ہے۔ سبحان اللہ پھر بھلا طلبہ مولانا کو دل و جان سے کیوں نہ چاہتے۔ یہی وجہ ہے کہ انتظامیہ کے ممبران سے لیکر اساتذہ و طلبہ تمام ہی مولانا کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ان سے مرعوب رہتے اور "بڑے مولانا" کے نام سے یاد کرتے۔ لیکن مولانا اپنی گفتگو سے کبھی ظاہر نہ ہونے دیتے کہ وہ بڑے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــ "اپنے بچوں کی دلجوئی کرو" مولانا طلبہ کے سلسلے میں ہمیشہ اس حدیث کو پیش نظر رکھتے۔ کسی طالب علم کے ہاتھوں اگر کوئی نقصان ہو جاتا تو عتاب و ملامت کے بجائے وقتی خفگی کا اظہار کر فرماتے بھی تو پھر ان کے ازالے کے لیے ایسی تدبیر اپناتے کہ طالب علم مولانا کا اسیر ہو کر رہ جاتا۔ مولانا حلیم و بردبار تھے اور بہت ہی بے لوث و بے نفس انسان تھے۔ سارا کام خود انجام دیتے تھے لیکن منصب و عہدہ لینے سے ہمیشہ گریز کرتے رہے۔ اہل اللہ کے حالات میں یہ چیز نمایاں طور پر نظر آتی ہے کہ وہ بہت مہمان نواز ہوتے ہیں کیونکہ یہ چیز صفات باطنی اور قلبی تونگری کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مہمان نوازی ان کی نمایاں خصوصیات میں سے تھی۔ وہ مہمانوں سے تپاک سے ملتے ان کی خوب خاطر مدارات کرتے۔

مولانا نہایت با اصول اور محتاط زندگی گذارتے تھے۔ اگر کسی کو کسی کام سے باہر بھیجتے تو وہ درس جو کہ اس بچے کا چھوٹ جاتا تھا تو اس کو بعد میں اسی محنت و لگن سے پڑھا دیتے تھے۔ ان کے کھانے پینے اور مطالعے کرنے کا ایک وقت متعین تھا مطالعہ تو ایک طرح سے انکی روحانی غذا تھی۔ ان کی اپنی ایک بڑی لائبریری تھی جس کو وہ "المکتبۃ الحسنۃ" کہا کرتے تھے۔

مولانا بڑے نفاست پسند اور صاحب ذوق تھے۔ لباس میں ہمیشہ تہبند اور لمبا کرتا زیب تن فرماتے۔ انکے سفید اور بے داغ کرتے پر کبھی کوئی شکن کہیں نظر نہیں آتی۔

مولانا عالم خشک بھی نہ تھے کہ ہر وقت کتابوں کی دنیا میں ہی کھوئے رہتے۔ انہیں موجودہ حالات کے متعلق بھی کافی اہم معلومات رہتیں، پابندی سے ریڈیو سے خبریں سنتے، اخبارات و رسائل کا بالاستیعاب مطالعہ فرماتے، ان کی ڈاک میں خطوط کے

علاوہ بے شمار مختلف ملکی و غیر ملکی اخبارات و رسائل آتے۔ اہم اہم خبروں کا وہ اپنے پاس ایک ریکارڈ رکھتے۔ درجوں میں بھی عام طور سے ان خبروں پر بے لاگ تبصرہ فرماتے۔ مولانا انقلاب ایران اور مجاہدین افغانستان کی کوششوں کو سراہتے تھے۔

اکثر جمعہ کا خطبہ بھی دیا کرتے تھے۔ جس جمعہ کو خطبہ دیتے نمازیوں کی تعداد میں غیر محسوس طریقے سے اضافہ ہوتا تھا۔ مولانا کا معمول تھا کہ عصر بعد اپنے کمرے کے سامنے چارپائی پر بیٹھ جاتے، جب بیٹھتے تو قرب و جوار سے کافی لوگ چھوٹے چھوٹے بچوں کو لیکر آتے کہ مولانا آپ دم کر دیں۔ اس طرح عصری مجلس کا اچھا خاصہ وقت عقیدتمندوں کی دلجوئی میں گذر جاتا تھا۔ دعا کرنے کے ساتھ ساتھ نماز پڑھنے کی تلقین بھی کرتے جاتے تھے۔ اس کے بعد موجود اساتذہ کرام اور طلبہ سے مختلف موضوعات پر گفتگو رہتی تھی۔ مولانا عام رجحانات سے پرے عربی تاریخ کو لکھنے اور درج کرنے میں ترغیب دلاتے اور لکھتے تھے۔

مولانا معاملے کے کھرے تھے۔ کسی کا ایک پیسہ نہ رکھتے تھے۔ مولانا ذاتی طور سے بھی مختلف لوگوں، اپنے پڑوسیوں، یتیموں اور بیواؤں کی مدد کیا کرتے تھے۔ طلبہ میں سے بھی کئی ایک کے اخراجات مولانا ہی اپنی قلیل آمدنی میں سے پورا فرماتے۔ مولانا حد درجہ خوددار تھے اگر وقت سے طلبہ ان کا کام کرنے کے لیے نہیں پہنچتے تو خود سے ہی کام گھسٹ گھسٹ کر انجام دیتے ہوئے نظر آتے۔ اپنی معذوری کے باوجود کبھی بھی کسی کے سامنے اپنی خودداری کو رسوا نہیں ہونے دیا۔ بڑی پروقار زندگی بسر کرتے رہے۔ بعض اوقات پریشانیاں بھی ہوئیں لیکن نہ طلبہ سے اور نہ ذمہ داران سے اف تک کہا۔ طلبہ جو کہ ان کے سب کچھ تھے، اور سارا کام انجام دیتے تھے ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ذمہ داران نے اعلان کر دیا کہ کوئی بھی طالب علم چھٹی میں یہاں نہیں رک سکتا اور یہ فیصلہ بہر حال مولانا کے لیے تکلیف دہ تھا لیکن مولانا نے ذمہ داران سے کچھ نہ کہا اور صرف ایک طالب علم کو بمشکل اپنی خدمت کے لیے روک سکے پھر بھی رمضان بھر پریشانی رہی لیکن آپ نے گوارہ کیا۔

یہ تھی مولانا کی زندگی، مومنانہ اور عارفانہ زندگی، نہایت پاکیزہ، دلکش اور قابل رشک زندگی۔ مولانا سچ علم و معرفت کے شہسوار، نیکی اور تقویٰ کے مجاہد اور کج قناعت کے بادشاہ تھے۔ اپنی سادہ زندگی کے لیے جو کچھ ضابطہ بنایا تھا اس پر سورج و چاند کی مانند بالکل کے ساتھ چلتے تھے۔

تعارف و تبصرہ

ابو عبدالرحمٰن عماد فلاحی

بزم سر سید (سالانہ میگزین ۱۹۹۷ء)

ایڈیٹر : صغیر احمد　　جوائنٹ ایڈیٹر : کے ایم اصف اعظمی
کتابت وطباعت : عمدہ　　صفحات : ۲۱۶　　قیمت : غیر مذکور
پتہ : ۱۰۵ یا ۳۹ سر سید ہال (نارتھ) اے ایم یو علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲ یوپی۔

زیر نظر مجلہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قدیم ترین ہاسٹل سرسید ہال (نارتھ) کا علمی، ادبی و ثقافتی ترجمان ہے جو وہاں کے طلبہ کی صلاحیتوں کو نکھارنے اور اہل علم و عوام کو ان سے متعارف کرانے کے لیے برابر نکلتا رہتا ہے۔ یہ شمارہ سر سید علیہ الرحمۃ کی صد سالہ برسی کی مناسبت سے کچھ زیادہ ہی اہتمام کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے۔ اور "گوشہ سر سید و مسلم یونیورسٹی" کے عنوان سے ایک معتد بہ حصہ مختص ہے۔ اس کے علاوہ اسلامیات، تعلیم و تربیت، بحث و نظر، طب و سائنس، شخصیات و ادبیات وغیرہ کالموں کے تحت بہت سے قیمتی مضامین شامل اشاعت ہیں۔ خصوصاً بحث و نظر کا موضوع "جدید مسلم یونیورسٹی" عمدہ ہے گرچہ شرکاء کم ہیں نتیجۃً بحث کا حق ادا نہیں ہو سکا ہے اس پر مزید مباحثے کی ضرورت ہے۔ عنوان سے ایسا لگتا ہے کہ شاید مجوز کا ذہن اس رخ پر جا رہا ہے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جو "جدت" کا علم لے کر آگے بڑھی تھی اس کی متحمل نہیں ہو پا رہی ہے۔ اور اس کی "جدت" اب "قدامت" میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ اس لیے "جدید مسلم یونیورسٹی" کی ضرورت ہے تاکہ وہ "جدید تقاضوں" کو پورا کر سکے۔ ورنہ کثرت تعداد کی وجہ سے مزید مسلم یونیورسٹیوں کے قیام کی ضرورت کا احساس دلانے کے لیے کسی مباحثے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو روز روشن کی طرح سے ظاہر و باہر ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر محمد شریف خاں صاحب (سابق صدر شعبہ تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کا یہ اقتباس بھی سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کا متقاضی ہے۔

"مجوزہ مسلم یونیورسٹی معیشت کی راہ ہموار کرنے کے لیے قائم کی جا رہی ہے مسلم اقدار اور مسلم ثقافت کو فروغ دینے کے لیے تو مسلم یونیورسٹی کے بجائے اسلامک

یونیورسٹی کو قائم کرنا ہوگا جو بین الاقوامی اسلامک یونیورسٹی ملیشیا کے طرز پر قائم کی جا سکتی ہے" (ص ۱۶۱)

تھوڑا مختلف ہی سہی لیکن اسی ذیل میں سید حامد صاحب (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کے مضمون سے ایک اہم پیراگراف بے ساختہ نقل کرنے کو جی چاہ رہا ہے جو اس موضوع پر سوچنے والوں کے لیے بھی مفید ہے اور تعلیم و تعلم سے وابستہ تمام ہی افراد کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

"تربیت کے بغیر تعلیم کا وہی انجام ہوتا ہے جو آب پاشی کے بغیر فرٹیلائزر استعمال کرنے کا ہوتا ہے۔ تربیت سے ہم مجرمانہ غفلت برت رہے ہیں۔ گھر پر ہم اپنے بچوں کو دین اور قدروں اور روایات سے بے بہرہ رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یونیورسٹیاں والدین کی طرف سے فرض کفایہ ادا کریں۔ ایسا نہ کبھی ہوا ہے نہ ہوگا۔ علی گڑھ نے دین کی بات کی، دین کی تعلیم کو نصاب کا جزو بنایا، شعبہ دینیات میں جا کر علی گڑھ کے ایک ممتاز سابق وائس چانسلر سید ہاشم علی نے جو کہا تھا وہ آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے انھوں نے کہا تھا "یہاں دینیات ہے دین نہیں ہے" (ص ۱۵۵۔۱۵۶)

چونکہ اس میگزین کے جوائنٹ ایڈیٹر کے ایم اصف فلاحی ہیں (گرچہ نہیں معلوم کہ کیوں انھوں نے اس نسبت کے اظہار سے گریز کیا ہے) اور توقع ہے کہ آئندہ وہ ایڈیٹر شپ کی ذمہ داریاں سنبھالیں گے اس لیے یہ امید لگانے میں ہم حق بجانب ہوں کہ وہ اس مباحثے کو آگے بھی جاری رکھیں گے تاکہ صحیح نتیجے پر پہنچا جا سکے۔

وہ نقائص جن کی توقع علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ سے نہیں کی جا سکتی اس ترجمان کے اندر پا کر سخت تکلیف ہوئی بغرض اصلاح اور بطور مثال صرف دو باتوں کا تذکرہ کرتا ہوں۔

(۱) مختلف مقامات پر اردو الفاظ کے غلط انگریزی مترادفات استعمال کیے گئے ہیں مثلاً ص ۱۳۵ پر "کارنامے" کیلئے (ACTIVITIES) کا استعمال درست نہیں ہے۔

(۲) جب یہ میگزین ہال کے ترجمان کی حیثیت سے منظر عام پر آتا ہے تو اس میں دوسرے مقامات سے وابستہ افراد کی نمائندگی چہ معنی دارد۔

جامعہ کے لیل و نہار

ادارہ

جناب محمد جعفر صاحب (قیم جماعت اسلامی ہند) کی آمد اور S.I.O. کی جانب سے تقسیم انعامات

جناب محمد جعفر صاحب (قیم جماعت اسلامی ہند، سابق صدر S.I.O. آف انڈیا) ۳۱ ر اگست ۱۹۹۸ء کو تنظیمی دورے پر جامعۃ الفلاح تشریف لائے۔ اس موقع سے مختلف تنظیمی نشستیں ہوئیں اور تقریباً تمام ہی ارکان جماعت کے ساتھ فرداً فرداً ملاقاتیں بھی رہیں۔ وقت کی قلت کی وجہ سے اساتذہ و طلبہ کی عمومی نشست تو نہ ہو سکی۔ البتہ S.I.O. ضلع اعظم گڑھ کی جانب سے منعقدہ تقسیم انعامات کے پروگرام میں عمومی طور پر سبھی کو استفادے کا موقع ملا۔ S.I.O. کی جانب سے یہ انعامات ششماہی امتحانات میں ۸۰ فیصد سے زائد نمبرات حاصل کرنے والے طلبہ کو حوصلہ افزائی کے لئے تقسیم کئے گئے۔ سب سے زیادہ قیمتی انعام عزیزم محمد الیاس سلمہ کے حصے میں آیا جو عربی چہارم کے طالبعلم ہیں اور جنھوں نے ۹۲ فیصد نمبرات حاصل کئے ہیں۔ انعامات کتابی شکل میں محترم قیم جماعت کے ہاتھوں تقسیم ہوئے۔ بعد میں آپ نے مبارکباد دیتے ہوئے فرمایا، مجھے شوق رہا کہ دینی تعلیم دینی ادارے میں حاصل کروں لیکن افسوس کہ محروم رہا خوش قسمتی سے آپکو یہ موقع حاصل ہے اسے غنیمت جانئیں محنت کر کے امتیازی مقام حاصل کرنا خود باعث مسرت ہوتا ہے۔ انعامات تو مزید مہمیز کا کام دیتے ہیں۔ اصلاً خلوص کے ساتھ کوشش کرنی چاہئے اور گیرائی و گہرائی پیدا کرنے کی طرف توجہ دینی چاہئے کیونکہ علم کا میدان نہایت وسیع بھی ہے اور سب سے زیادہ قابل قدر بھی۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنایا تو ان کی سب

سے نمایاں خوبی علم کو قرار دیا۔ انبیاء کی بنیادی خصوصیت بھی یہی تھی۔ اسی کے ذریعہ خلافت و امامت قائم کی جاسکتی ہے۔ محدود علم کے ساتھ یہ فریضہ انجام نہیں دیا جا سکتا۔ علوم کے مختلف میدان میں ایسے ماہرین کی شدید ضرورت ہے جو اسلام کے مطابق رہنمائی فراہم کر سکیں۔ علم کی منزل عالمیت و فضیلت پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اصل کام ...... تجدید دین ...... کا مرحلہ اس کے بعد شروع ہوتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس کو سامنے رکھنا چاہئے۔ اگر یہ کام انجام پاتا ہے تو سمجھا جاسکتا ہے کہ آپ نے علم کا صحیح مقصد سمجھا اور انسانیت کی کچھ خدمت کی۔ اس موقع سے امیر حلقہ یوپی، محترم محمد نصرت صاحب اور ناظم اطلاع اعظم گڑھ جون پور وغیرہ محترم مولانا سکندر علی اصلاحی صاحب بھی شریک مجلس تھے اور انہوں نے بھی طلبہ کو نصیحتیں کیں۔ اخیر میں مولانا انعام الدین صاحب کی دعا پر محفل اختتام کو پہنچی۔

S.I.M. کی جانب سے "اسلام اور باطل ادیان و نظریات" کے عنوان پر انعامی سیمنار

S.I.M. فلاح یونٹ کی جانب سے انصار و امیدواران انصار کے مابین ۲۷ / ۲۸ ر اگست ۱۹۹۸ء کو انعامی سیمنار منعقد کیا گیا جس کا عنوان "اسلام اور باطل ادیان و نظریات" رکھا گیا تھا۔ مختلف نشستوں میں دس مقالات پڑھے گئے اور تمام ہی مقالات پر سوال و جواب کا سلسلہ بھی رہا۔ نتائج اس طرح رہے

پوزیشن	نام	عنوان	شرح انعام
اول	شمیم قمر	صہیونیت اور اسلام	۳۰۰
دوم	عبدالحی	جمہوریت اور اسلام	۳۰۰
سوم	عبیدالرحمن	ہندتو اور اسلام	۲۰۰
سوم	نفیس ریاض	عیسائیت (?) و جرم اور اسلام	۲۰۰

انکے علاوہ تمام شرکاء کو ساٹھ ساٹھ روپے کے تشجیعی انعام سے بھی نوازا گیا۔

مہمان خصوصی مولانا مبین الحق قاسمی صاحب تھے۔ انہوں نے تبصرہ کرتے ہوئے شرکاء وطلبہ کو مفید مشورے دیے نیز فرمایا:

انسانیت کے مسائل حل کرنے میں ادیان کی ناکامی اور نظریاتی خلاء پیدا ہونے کی وجہ سے تقابل ادیان کا موضوع آج وقت کی ضرورت بن گیا ہے۔ خصوصاً اسلامی بیداری کے تناظر میں اس کی اہمیت مزید بڑھ گئی ہے۔ اس لئے شدید ضرورت ہے کہ حقائق سامنے لائے جائیں۔ لیحق الحق ویبطل الباطل ولو کرہ المجرمون۔ لیکن چونکہ یہ موضوع انتہائی حساس بھی ہے اس لئے بہت عرق ریزی اور بیدار مغزی کی ضرورت ہے تاکہ ہم منصفانہ انداز میں کلام کر سکیں دلائل و براہین کے ذریعہ اس کی قلعی کھول سکیں اور حجت کے میدان میں بھی زیر کر سکیں۔

بین المدارس انعامی مقابلوں کی تیاریاں | جیسا کہ پہلے خبر دی جا چکی ہے کہ مدارس کے درمیان قربت و ہم آہنگی پیدا کرنے اور ایک دوسرے کے تجربات سے استفادہ کرنے نیز طلبہ کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارنے کے لئے ۲۲ر تا ۲۴ر ستمبر ۱۹۹۶ء جامعہ کے زیر اہتمام بین المدارس قرأت اور تحریر و تقریر کے انعامی مقابلے رکھے گئے ہیں۔ اس کی تیاریاں الحمد للہ زوروں پر چل رہی ہیں۔ پروگرام کا تفصیلی خاکہ ترتیب دیا جا چکا ہے۔ مختلف شعبہ جات کے ذمہ داروں کی تعیین بھی ہو چکی ہے۔ مولانا نعیم الدین صاحب اصلاحی پورے پروگرام کے ناظم منتخب کئے گئے ہیں۔ اب تک تقریباً بیس مدارس سے مختلف پروگراموں میں ان کی شرکت کی اطلاع بھی مل چکی ہے۔ ذمہ داران جامعہ بھی مہمانوں کے استقبال کے لئے جملہ تیاریوں میں مصروف ہیں۔

دعوتی وفود | ۳۰ر ۳۱ر اکتوبر و یکم نومبر ۱۹۹۶ء کو الہ آباد میں منعقد ہونے والی شمالی ہند کانفرنس کی تیاریاں بھی زوروں پر ہیں۔ وال رائیٹنگ اور بینر لگائے جانے کے علاوہ مختلف وفود کی شکل میں اساتذہ مضافات میں دعوت و تبلیغ کے لئے جا رہے ہیں۔ تقریباً بیس گاؤں کو نشانے پر رکھا گیا ہے۔ جن میں دس بارہ گاؤں کا دورہ مکمل ہو چکا ہے۔ روزانہ بعد عصر جاتے ہیں اور عشاء کے وقت واپس آتے ہیں۔ اس دوران ہر دروازے پر دستک دیتے ہیں خواہ وہ کسی مسلمان کا دروازہ ہو یا غیر مسلم کا۔ پہلے وہ اسلام کا تعارف کراتے ہیں، توحید کے تقاضے بتاتے ہیں، جماعت اسلامی کے پیغام اور سرگرمیوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ شمالی ہند کانفرنس کے مرکزی موضوع "ففروا الی اللہ" پر روشنی ڈالتے ہیں اور پھر شرکت کی دعوت دیتے ہیں۔

واضح رہے کہ اس پیغام کو پہنچانے اور اس کام میں جملہ اساتذہ کرام کا تعاون حاصل کرنے کیلئے اتنی اجتماعی نشستیں بھی منعقد کی گئی ہیں۔ معلمین کیلئے الگ جس میں مولانا نظام الدین صاحب اور مولانا محمد طاہر صاحب نے خطاب فرمایا اور معلمات کے لئے الگ جس میں مولانا نظام الدین صاحب اور مولانا رحمت اللہ صاحب نے خطاب فرمایا۔ الحمد للہ اس کے خوشگوار اثرات پڑے ہیں اور سبھی کا بھرپور تعاون مل رہا ہے۔

نئی تقرری | تاخیر سے ملی اطلاع کے مطابق جناب محمد عرفان احمد عثمانی صاحب یکم مئی ۱۹۹۶ء سے بحیثیت کلرک مطبخ جامعہ میں تشریف لائے تھے۔ یہ جامعہ کا ایک اہم اور گراں بار شعبہ ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ انھیں اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی انجام دینے کی توفیق عنایت فرمائے۔ آپ رام پور ضلع مئو کے رہنے والے ہیں اور اس سے پہلے تجارت کر رہے تھے۔

اظہار تعزیت | ۷ر اگست ۱۹۹۶ء کو صبح ساڑھے سات بجے اعظم گڈھ ریلوے

کراسنگ کے پاس بریک فیل ہونے کی وجہ سے ایک بہت ہی دردناک ایکسیڈنٹ ہوا۔ کئی لوگ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان میں مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحی کے جواں سال بھتیجے اور جناب محمود احمد فلاحی کے بھائی جناب ایاز احمد صاحب بھی تھے۔ موصوف نے ابتدائی تعلیم جامعۃ الفلاح میں حاصل کی تھی۔ ان دنوں بمبئی میں مقیم تھے اور گھر آرہے تھے۔ اس میں محترمہ راشدہ فلاحی صاحبہ کی والدہ (جو جناب عبداللہ ترابی فلاحی کی خوش دامن تھیں) بھی سوار تھیں وہ بھی جائے حادثہ پر ہی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اللہ ان سب کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عنایت فرمائے۔ آمین!

یہ خبر بھی انتہائی تکلیف دہ ہے کہ ۲۹ر اگست ۱۹۹۸ء کی شام مولانا مطیع اللہ صاحب فلاحی کا بالکل نوزائیدہ نواسہ اللہ کو پیارا ہو گیا حالانکہ اسی دن صبح اس نے دنیا میں آنکھ کھولی تھی۔ اللہ اسے پس ماندگان کے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین!

محترمہ راحلہ فلاحی بنت عبدالحسیب اصلاحی اللہ کو پیاری ہو گئیں

طویل علالت کے بعد محترمہ راحلہ فلاحی (فضیلت ۱۹۸۹ء) ۵ر ستمبر ۱۹۹۸ء کو ڈاکٹروں کے جواب دینے کے بعد بنارس سے لوٹتے ہوئے اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ادھر کئی مہینوں سے مختلف عوارض نے انہیں گھیر رکھا تھا۔ پہلے اعظم گڑھ زیر علاج رہیں پھر بنارس لے جائی گئی تھیں۔

آپ کافی ہونہار تھیں۔ بعد از فراغت شعبہ اعلیٰ (کلیۃ البنات) میں استاذ بھی رہی تھیں۔ شادی کے بعد استعفاء دے دیا تھا۔ جناب ابو طلحہ اصلاحی بن محمد ایوب اصلاحی سے آپ کا نکاح ہوا تھا۔ دو بچیاں اور ایک بچہ پیچھے چھوڑ گئی ہیں۔ اللہ پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عنایت فرمائے اور انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ آمین!

رپورٹ دہلی یونٹ

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح دہلی یونٹ کی ایک نشست ۱۳ر ستمبر کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جامع مسجد میں بعد نماز عصر ہوئی۔ نشست کا اہتمام جامعۃ الفلاح کے بعض اساتذہ اور انجمن کے مرکزی ذمہ داران کی دہلی آمد کے موقع سے ہوا تھا جس میں تقریباً اسی فلاحی برادران نے شرکت فرمائی۔ نشست کے صدر انجمن مرکزی صدر انجمن مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی تھے۔

نشست کا آغاز برادر اکرام الرحمن فلاحی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ محترم صدر دہلی یونٹ نے مولانا ابو الکلام فلاحی ازہری نے استقبالیہ کلمات کے اور اساتذہ و جملہ ذمہ داران انجمن کو خوش آمدید کہا۔ بعد ازاں استاذ و صدر شعبہ اعلیٰ جامعۃ الفلاح مولانا محمد طاہر مدنی نے گراں قدر تذکیری کلمات فرمائے۔ انہوں نے طلب علم کے لئے کوششوں اور مقاصد جامعہ سے خود کو ہم آہنگ رکھنے پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا۔ تذکیر کے بعد انجمن اور مادر علمی کے مختلف مسائل زیر بحث آئے۔ حیات نو کا مسئلہ ایک بار پھر شدت کے ساتھ اٹھایا گیا۔ نشست میں موجود نمائندۂ حیات نو مولانا اظہار احمد فلاحی صاحب نے یقین دلایا کہ بہت جلد حیات نو معمول پر آجائے گا۔ البتہ انہوں نے فلاحی برادری سے خصوصی قلمی تعاون کی اپیل کی۔ انہوں نے کہا کہ اس کے بغیر حیات نو کو معیاری بنانا اور معمول پر لانا مشکل ہوگا۔

صدر انجمن نے اپنے صدارتی کلمات میں مقاصد انجمن کو واضح کرتے ہوئے یہ توقع ظاہر کی کہ ہر فلاحی اس میں اپنا رول ادا کرے گا۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے درمیان باہمی تعاون اور تعلقات بہت اچھے ہونے چاہئیں۔ دہلی کے حوالے سے موصوف نے فرمایا کہ یہاں کی یو اور میں داخلہ کیلئے آنے والے فلاحیوں کے ساتھ پہلے سے موجود فلاحیوں کا تعاون بہت اچھا ہونا چاہئے اور ان کے مسائل میں دلچسپی لے کر انہیں حل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ [illegible] استاذ جامعہ مولانا سلامت اللہ صاحب کی دعا پر ہوا۔ بعد ازاں مغرب [illegible] نشست کا سلسلہ جاری رہا اور اس میں جدید طلبہ کے مسائل پر خصوصی گفتگو ہوئی۔ [illegible] مختلف مشورے سامنے آئے۔ جن اساتذۂ جامعہ نے نشست میں شرکت کی ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں: ۱۔ مولانا سلامت اللہ صاحب، ۲۔ مولانا محمد طاہر مدنی صاحب، ۳۔ مولانا [illegible] اللہ عمری صاحب، ۴۔ مولانا مطیع اللہ فلاحی صاحب، ۵۔ مولانا اظہار احمد فلاحی صاحب۔